الرسالہ

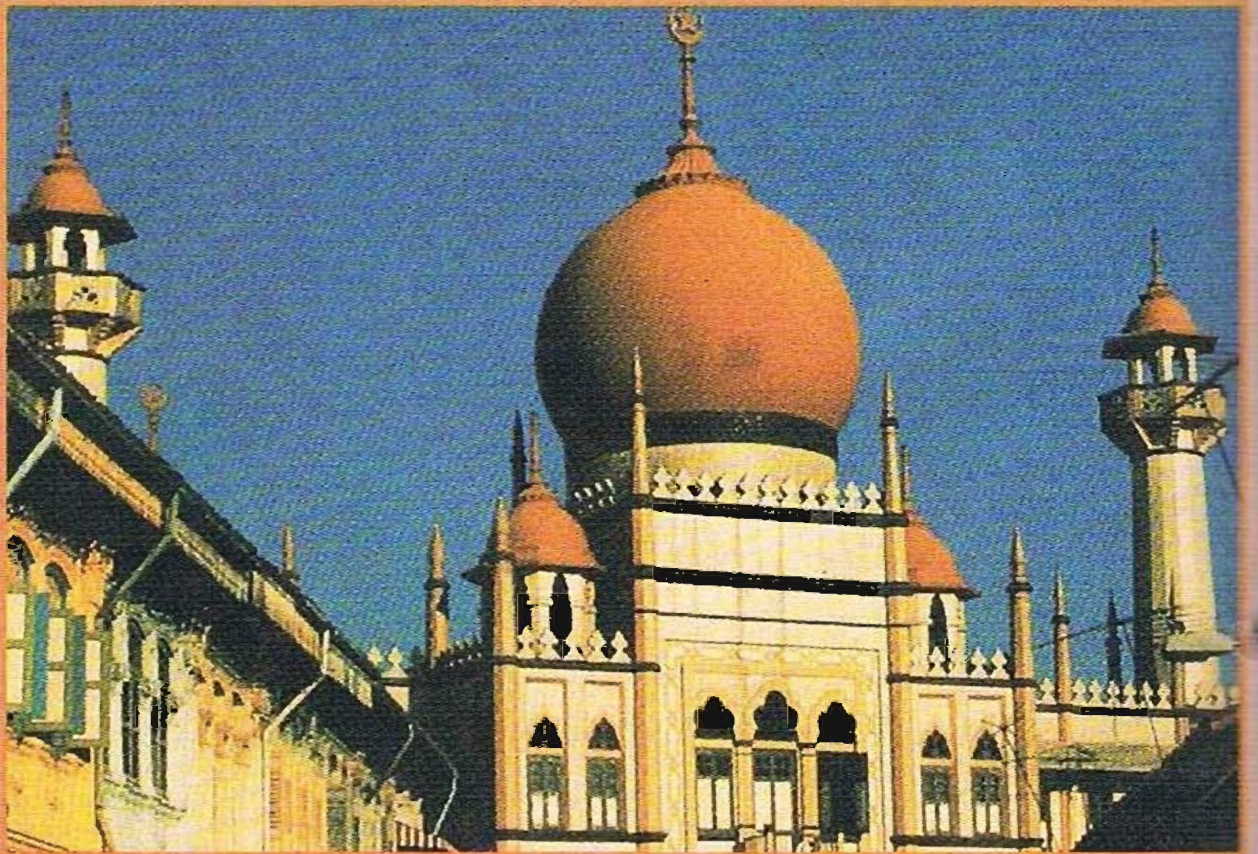
Al-Risala

May 1997 • No. 246 • Rs. 8

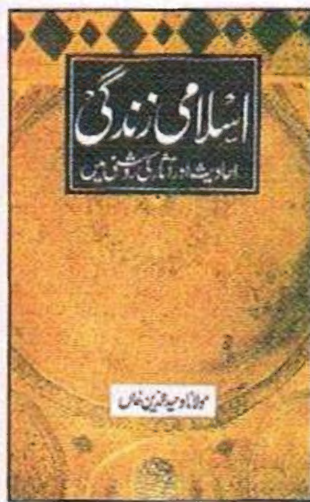
اگر خاموشی کے مقابلہ میں بولنا زیادہ اچھا ہوتا

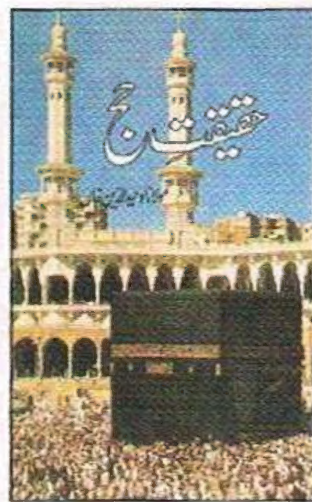
تو ہر درخت کے اوپر

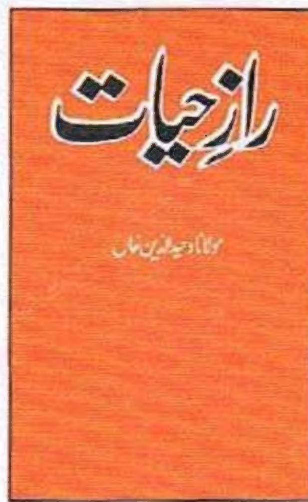
لاوڈ اسپیکر لگے ہوئے نظر آتے۔



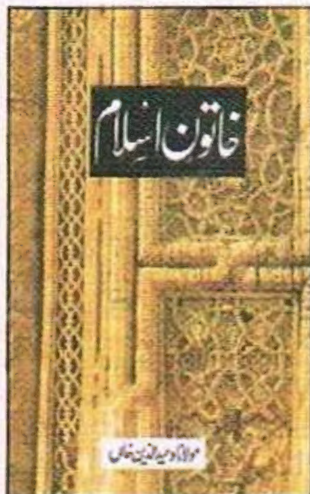
The Sultan Mosque, Singapore

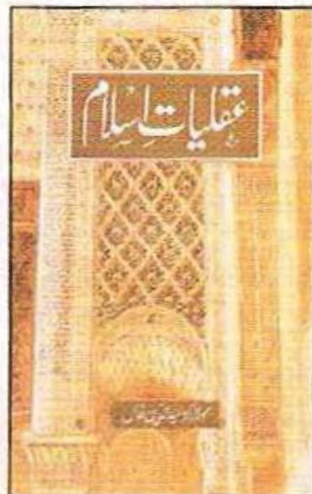

اسلامی زندگی
احادیث اور آثار کی روشنی میں
مولانا وحید الدین خاں

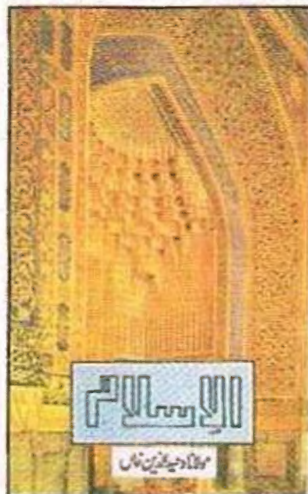

حقیقت حج
مولانا وحید الدین خاں

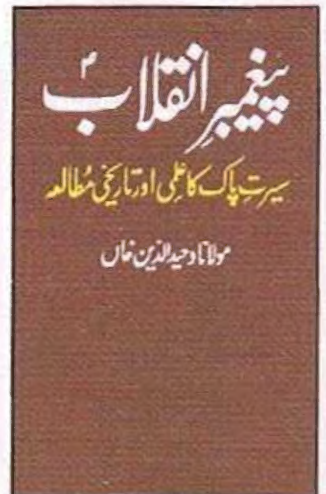

رازِ حیات
مولانا وحید الدین خاں

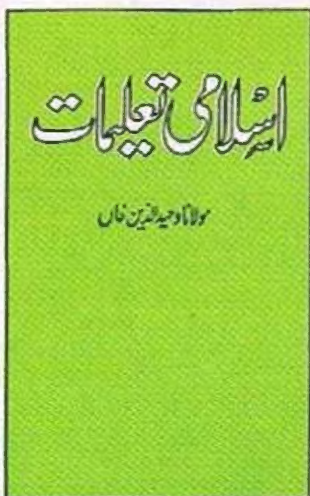

تجدید دین
مولانا وحید الدین خاں

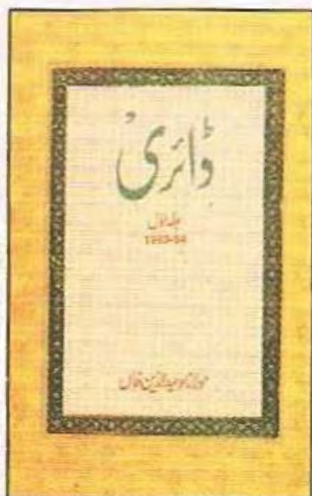

خاتون اسلام
مولانا وحید الدین خاں

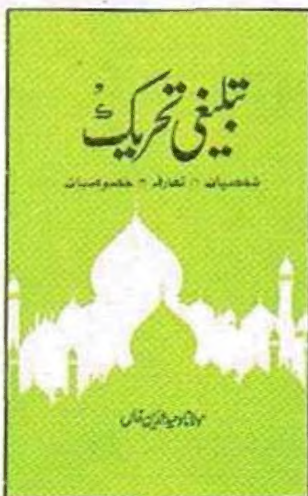

عقلیاتِ اسلام


الاسلام
مولانا وحید الدین خاں

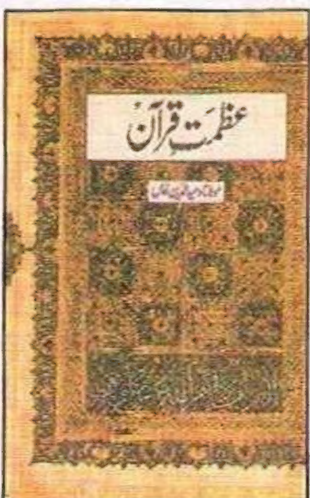

پیغمبرِ انقلاب
سیرتِ پاک کا علمی اور تاریخی مطالعہ
مولانا وحید الدین خاں

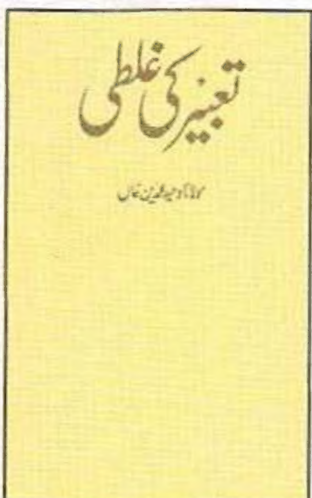

اسلامی تعلیمات
مولانا وحید الدین خاں

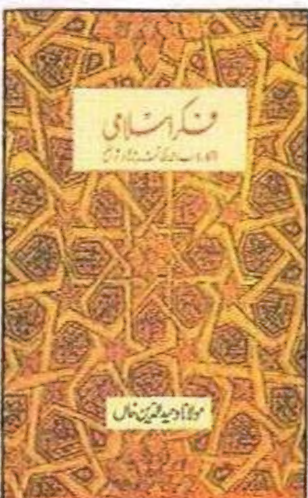

ڈائری
مولانا وحید الدین خاں

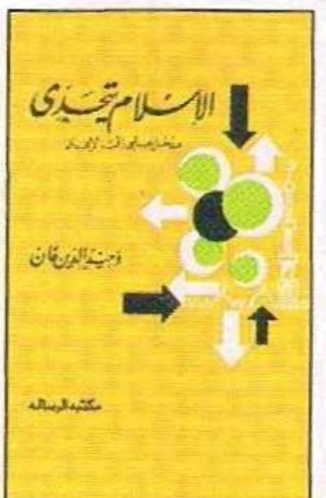

تبلیغی تحریک
شخصیات، تعارف، خصوصیات
مولانا وحید الدین خاں


انبیاء اسلام


عظمتِ قرآن
مولانا وحید الدین خاں


تعبیر کی غلطی
مولانا وحید الدین خاں


فکر اسلامی
مولانا وحید الدین خاں


الاسلام یتحدی
وحید الدین خان
مكتبة الرسالة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

مئی ۱۹۹۷ ، شمارہ ۲۴۶

فہرست — صفحہ

ضروری اعلان

- الرسالہ ہندی کی اشاعت بھوپال سے شروع ہوگئی ہے۔
- الرسالہ کے پرانے شمارے صرف ایک روپے میں۔

تفصیل صفحہ ۵۰ پر دیکھیں۔

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DESU,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
E-mail: risala.islamic.@axcess.net.in.

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

حقیقتِ اسلام

اسلام ایک خدائی صداقت ہے۔ اسلام اولاً اور اصلاً نفس انسانی میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ پھر ایک ذات کی سطح پر اس کا ایک انفرادی فارم بنتا ہے، اور مسلم گروہ کی سطح پر اس کا ایک اجتماعی فارم تیار ہوتا ہے۔ تاہم دونوں ہی قسم کے فارم کا تعلق خارجی حالات پر ہے۔ ان میں سے کوئی بھی مطلق نہیں۔ خارجی حالات جس درجہ میں موافقت کریں گے اسی درجہ میں یہ فارم بھی بنے گا۔ مثلاً ایک شخص زاد راہ رکھتا ہے اور راستے بھی محفوظ ہیں تو وہ حج کرے گا، ورنہ وہ حج نہیں کرے گا۔ اسی طرح کسی مسلم سماج میں اگر حالات موافق ہیں تو قانون اسلامی کا عملی نفاذ کیا جائے گا ورنہ ذہنی فضا بنانے پر اکتفا کی جائے گی۔

مگر جہاں تک نفس انسانی کا تعلق ہے، وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے۔ یہاں ایک انسان کو ہر حال میں یہ موقع رہتا ہے کہ وہ اپنے اسلام کو ترقی دے۔ وہ لامحدود طور پر اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگتا چلا جائے۔

اسلام میں سب سے بڑی عبادت خدا کا ذکر ہے۔ یعنی خدا میں سوچنا اور اس کو یاد کرنا۔ یہ ذکر ایک نہ ختم ہونے والا عمل ہے۔ اس کا آغاز تو ہے مگر اس کا کوئی اختتام نہیں۔ اسی لیے ذکر ہی واحد عمل ہے جس کو قرآن میں کثیر مقدار میں کرنے کا حکم دیا گیا ہے (الاحزاب ۴۱)

آدمی کے لیے لامحدود طور پر یہ موقع ہے کہ وہ معرفت خداوندی کے سمندر میں نہائے۔ وہ ہر آن اور ہر حال میں اللہ کے جلال وجمال سے اپنے لیے روحانی رزق حاصل کرتا رہے۔ وہ اپنی ذات میں غور کر کے خدا کو یاد کرے اور آفاق کی وسعتوں میں آلاء اللہ کا مشاہدہ کر کے اس سے سرشار ہوتا رہے۔ وہ ہر پیش آنے والے واقعہ سے ربانی سبق لے۔ وہ ہر لمحۂ حیات میں شکر اور صبر اور تقویٰ اور دعا اور استغفار کی کیفیات میں غرق رہے۔

تاہم موجودہ زمانہ میں ایک نئی چیز ظہور میں آئی ہے جس کو اسلام کی انقلابی تشریح کہا جاتا ہے۔ اس سے متاثر ہو کر بہت سے مسلمان دنیا کے ہر حصہ میں سرگرم ہیں۔ مگر یہ اسلام کے نام پر غیر اسلام ہے۔ یہ ایک غیر مطلوب صورت حال ہے نہ کہ کوئی بابرکت چیز۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے فکری انحرافات میں یہ سب سے بڑا انحراف ہے جو اسلام کے نام پر اٹھنے والی انقلابی تحریکوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

موجودہ زمانہ کے فکری انحرافات میں یہ سب سے بڑا انحراف ہے۔ ان تحریکوں کے علم بردار اپنے خیال کے مطابق، اسلام کی جامع تشریح پیش کرتے ہیں۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلام کی صرف ناقص تشریح کر رہے ہیں۔ اس ناقص تشریح نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان اسلام کی پوری تاریخ میں کسی اور چیز نے نہیں پہنچایا۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔

"انسان صرف ایک جسمانی ڈھانچہ نہیں ہے، وہ ایک مکمل سماجی اور معاشی اور سیاسی وجود ہے" ——— یہ جملہ بظاہر انسان کی شخصیت کا جامع بیان ہے۔ مگر حقیقت میں وہ اس کو محدود کرنے والا ہے۔ وہ اس ناقص طرز فکر کا نتیجہ ہے جس کو علم النفس کی اصطلاح میں دو قسمی طرز فکر (dichotomous thinking) کہا جاتا ہے۔ یعنی چیزوں کو بلیک اینڈ وھائٹ میں لینا۔ دو کے سوا کسی تیسری حقیقت سے بے خبر رہنا۔

بظاہر یہ ایک جامع یا تکمیلی بیان ہے۔ مگر اس میں انسانی شخصیت کا تیسرا اہم ترین حصہ چھوٹ گیا ہے، اور وہ اس کا داخلی وجود ہے۔ انسان کا ذہن، اس کی کیفیات، اس کے جذبات جو انسان کی عظیم تر اندرونی ہستی کی تشکیل کرتے ہیں، وہ انسانیت کی اس تشریح میں سرے سے غیر مذکور ہو کر رہ گئے ہیں۔

ٹھیک یہی معاملہ اسلام کی نام نہاد انقلابی تشریح کا بھی ہے۔ اس کے علم برداروں کا کہنا ہے کہ اسلام صرف ایک محدود مذہب نہیں ہے، وہ ایک مکمل سیاسی اور معاشی اور معاشرتی نظام (politico-socio-economic system) ہے۔ مگر یہ بظاہر جامع تشریح اسلام کی انتہائی ناقص تشریح ہے۔ اس تشریح میں دوبارہ اسلام کا وہ اہم ترین پہلو حذف ہو گیا ہے جو اس کا اصل پہلو ہے، یعنی اسلام کا ربانی اور احسانی پہلو۔

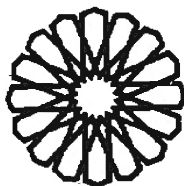
اسلام جب ایک انسان کی ہستی میں داخل ہوتا ہے تو اس کے بعد جو سب سے بڑا واقعہ رونما ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کی شخصیت ایک نئی دریافت کا تجربہ کرتی ہے۔ یہ خدائے عظیم

کی معرفت ہے۔ اس معرفت کے نتیجہ میں اس کی داخلی دنیا میں ایک ناقابل بیان قسم کا روحانی بھونچال آجاتا ہے۔ خدا کی آتشیں یاد اس کے سینہ میں سمندری طوفان سے بھی زیادہ بڑا طوفان برپا کر دیتی ہے۔ وہ ایک ایسی لامحدود دنیا میں جینے لگتا ہے جو سیاسی اور حکومتی وسعتوں سے بہت زیادہ وسیع ہے۔

ایسے انسان کے اندر تخلیقی صلاحیت اپنی اعلیٰ ترین صورت میں ابھر آتی ہے۔ وہ زندگی کی ادنیٰ سطح سے اوپر اٹھ کر زندگی کی اعلیٰ سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ محدود مادی دنیا سے آگے جاکر وہ لامحدود اخروی دنیا کا تجربہ کرنے لگتا ہے۔ عام انسانی ذہن کے اگر چند دریچے کھلتے ہیں تو اس کے ذہن کے تمام دریچے کھل جاتے ہیں۔ وہ برتر حقیقت کی لامحدود فضا میں پرواز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ایسا انسان گویا کہ خدا کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ خدا کی قربت کا آسمانی تجربہ کرتا ہے۔ خدا کے ساتھ اس کی سرگوشیاں ہونے لگتی ہیں۔ نورانی فرشتے قطار در قطار اس کے اوپر نازل ہوتے ہیں۔ ہر واقعہ اس کے لیے ایمانی خوراک فراہم کرتا ہے، ہر مشاہدہ اس کے ایمان میں اضافہ کا سبب بن جاتا ہے۔

یہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو بظاہر مادی دنیا میں ہوتا ہے مگر اپنی نفسیات کے اعتبار سے وہ عالم روحانی میں جینے لگتا ہے۔ اس کی روح ایک لطیف ربانی غسل میں نہا کر ایک برتر روح بن جاتی ہے۔ وہ مسلسل تزکیہ کے مراحل طے کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کے الفاظ میں، وہ النفس المطمئنہ کے درجہ کو پالیتا ہے۔ وہ اپنی داخلی صفات کے اعتبار سے ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو خدا کے پڑوس میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ جس کے لیے ابدی جنتوں کے دروازے ابدی طور پر اس طرح کھول دیے جائیں کہ کوئی بھی دروازہ اس کے لیے بند نہ رہے۔



تسبیح خواتین

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاجزادی حضرت فاطمہؓ کو خاص طور پر ایک تسبیح بتائی۔ یہ عام طور پر تسبیح فاطمہ کے نام سے مشہور ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم ۳۳ بار کہو: سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ پھر ۳۳ بار کہو: الحمد للہ، الحمد للہ۔ پھر ۳۴ بار کہو: اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ یہ سب ملا کر ایک سو بار ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس میں تمہارے لیے بہت زیادہ ثواب ہے۔

اس تسبیح کو تسبیح فاطمہ کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ ہی کو اس کی تلقین فرمائی تھی۔ لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے حضرت فاطمہ کے واسطہ سے امت کی تمام خواتین کو ذکر کا یہ قیمتی تحفہ عطا فرمایا ہے۔ بظاہر وہ تسبیح فاطمہ ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ تسبیح خواتین ہے۔

اصل یہ ہے کہ فطری طور پر عورتوں کا ایک خاص مزاج ہے۔ اس مزاج کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عورتیں جب اکٹھا ہوتی ہیں تو وہ فوراً ایک دوسرے کی باتوں کا غیر ضروری چرچا کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ کسی نہ کسی کے بارہ میں جا و بے جا باتیں ان کا موضوع گفتگو بن جاتی ہیں۔ یہ عورتوں کی ایک عام کمزوری ہے جس سے بہت کم عورتیں اپنے کو محفوظ کر پاتی ہیں۔

مذکورہ تسبیح عورتوں کو اس گناہ سے بچانے کی ایک تدبیر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح خواتین کو ایک اچھی مشغولیت دے دی ہے جس میں اپنے آپ کو مصروف کر کے وہ ثواب بھی حاصل کریں اور آخرت کے نقصان سے بھی بچ جائیں۔

خاص طور پر زیادہ عمر کی عورتوں کے لیے وہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ ایک عورت کی عمر جب بڑھتی ہے تو اس کے بعد اس کی عملی مصروفیت اسی نسبت سے کم ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے اپنے خالی وقت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ وہ دوسروں کے بے جا تذکرہ میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ تسبیح کی صورت میں خدا کا ذکر کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ دنیا میں اس کو قلبی سکون حاصل ہوگا اور آخرت میں جنت کا ابدی آرام۔

عالمی اسلامی اتحاد

کوئی شخص عالمی انسانی اتحاد کی بات کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ "انسانیت" کے نام پر ایک مرکزی حکومت قائم کی جائے اور ساری دنیا کے انسانوں کو طاقت کے زور پر اس کا تابع بنایا جائے۔ عالمی انسانی اتحاد انسانی قدروں کی بنیاد پر مطلوب ہے نہ کہ سیاسی اقتدار کی بنیاد پر۔

یہی معاملہ اسلام کا ہے۔ اسلام میں بلاشبہہ یہ مطلوب ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں اتحاد ہو۔ حج کا عالمی اجتماع اسی کی ایک علامت ہے۔ مگر عالمی اسلامی اتحاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی ایک مرکزی حکومت قائم ہو، اور تمام دنیا کے مسلمان اس حکومت (یا خلافت) کے تحت سیاسی طور پر متحد ہو جائیں۔ عالمی اسلامی اتحاد بلاشبہ ایک مطلوب چیز ہے۔ مگر عالمی اسلامی حکومت یا عالمی اسلامی خلافت محض ایک نعرہ ہے جو نہ ممکن ہے اور نہ مطلوب۔

اسلام میں اصل اہمیت کی چیز خدا کی سچی معرفت ہے اور یہ کہ آدمی خدا کی مرضی کے مطابق دنیا میں جئے۔ ہر ایک خدا کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔ ہر انسان اپنی پسند اور ناپسند کو خدا کی پسند اور ناپسند کے تابع بنالے۔

اسلامی اتحاد یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک خدا کو اپنا الٰہ سمجھیں۔ وہ محمد رسول اللہؐ کو پیغمبر اور خاتم النبیین مانتے ہوں۔ سب یکساں طور پر قرآن کے اوپر ایمان رکھتے ہوں۔ سب کے دلوں میں یہ یقین زندہ ہو کہ موجودہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے، اور آخرت کی اگلی دنیا اپنے عمل کا انجام پانے کی جگہ۔

اسی طرح ساری دنیا کے مسلمانوں میں وہی اخلاق و کردار ہو جو قرآن و سنت میں بتایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک شخص جب کسی مسلمان سے ملے تو وہ پیشگی طور پر یقین کر سکے کہ وہ اپنی عادت اور اپنے سلوک اور اپنے کردار کے اعتبار سے فلاں قسم کا انسان ہوگا۔

عالمی اسلامی اتحاد کی بنیاد فکری اور روحانی یکسانیت ہے نہ کہ عالمی نوعیت کا کوئی سیاسی اور حکومتی ڈھانچہ۔ اسلامی اتحاد اسلامی افراد کے آزادانہ فیصلہ سے قائم ہوتا ہے۔ وہ سیاسی اقتدار کے زور پر نافذ نہیں کیا جاتا اور نہ نافذ کیا جا سکتا۔

خود اعتمادی

۱۹۷۵ میں ساؤتھ کوریا نے اسٹیل فیکٹری کا ایک منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے انھیں ورلڈ بینک کے قرض کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اس کی درخواست بھیجی۔ اس کے بعد حسب قاعدہ بینک کے ماہرین کی ایک پارٹی کوریا گئی تاکہ وہ برسر موقع حالات کا مطالعہ کرے۔ اس پارٹی نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ رپورٹ دی کہ کوریا کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ منصوبہ قابل عمل (feasible) نہیں ہے، چنانچہ ورلڈ بینک نے کوریا کو اس مقصد کے لیے قرض دینے سے انکار کردیا۔

مگر ساؤتھ کوریا کے لوگوں نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے دوسرے ذرائع تلاش کیے اور کسی نہ کسی طرح اپنی فیکٹری قائم کردی۔ ۲۰ سال بعد کوریا کی یہ فیکٹری دنیا کی دوسری سب سے بڑی اسٹیل فیکٹری بن چکی تھی۔ ورلڈ بینک کا ایک ایکسپرٹ دوبارہ کوریا آیا تاکہ وہ قائم شدہ فیکٹری کو دیکھے۔ اس نے قریب سے فیکٹری کا معائنہ کرنے کے بعد دوبارہ لکھا کہ ۲۰ سال پہلے ہم نے جو بات کہی وہ بجائے خود صحیح تھی۔ مگر ہم اپنے جائزہ میں ایک چیز کو شامل نہ کر سکے تھے، وہ یہ کہ کوریا کے لوگ خود اعتمادی (self-confidence) کا لامحدود ذخیرہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔

خود اعتمادی خدا کی دی ہوئی ایک صفت ہے۔ وہ ہر ایک کو یکساں طور پر ملتی ہے۔ البتہ کچھ لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس خداداد صفت کو استعمال کرنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

مثلاً کوریا کے لوگ بینک کے انکار کے بعد اگر یہ کہنا شروع کرتے کہ بینک والے متعصب ہیں۔ وہ ہماری ترقی نہیں چاہتے۔ وہ ہم کو اقتصادی پس ماندگی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ تو ان کی خود اعتمادی کی صفت دب کر رہ جاتی۔ ان کا ذہن عمل کے رخ پر چلنے کے بجائے شکایت اور احتجاج کے رخ پر چل پڑتا۔ اور جب وہ ایسا کرتے تو ان کے اندر خود اعتمادی والے جذبات ابھرنے سے رہ جاتے۔ یہ خداداد صفت ان کے اندر چھپی ہوئی موجود رہتی مگر وہ اس کے عملی استعمال سے محروم رہتے۔ کوریا کی فضا شکایتی الفاظ سے بھر جاتی مگر وہاں کوئی اسٹیل فیکٹری کام کرتی ہوئی نظر نہ آتی۔

خدا نے انسان کو ہر قسم کی اعلیٰ صلاحیتیں وافر مقدار میں عطا کی ہیں۔ مگر ان کو استعمال کرنا صرف انھیں بلند حوصلہ لوگوں کے لیے مقدر ہے جو مثبت طرز فکر کے حامل ہوں، جو منفی طرز فکر سے آخری حد تک پاک ہوں۔

رہنما کی اہمیت

صحیح البخاری (کتاب مناقب الانصار) میں ایک طویل حدیث آئی ہے۔ خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضؓ سے ایک خاتون نے پوچھا کہ دین کا معاملہ کب تک درست رہے گا۔ حضرت ابوبکر نے جواب دیا: بقاؤکم علیہ ما استقامت بکم ائمتکم (فتح الباری ۷/۱۸۲) یعنی دین صحیح پر تم لوگ اس وقت تک قائم رہو گے جب تک تمہارے رہنما درست رہیں۔

کوئی تحریک خواہ وہ اچھی ہو یا بری، ہمیشہ رہنما طبقہ اس کو چلاتا ہے۔ کسی قوم کا رہنما طبقہ ہی اس قوم کا ذہن ساز طبقہ (opinion-maker class) ہوتا ہے۔ وہی عوام کو کسی اشو پر موبیلائز کرتا ہے، وہی لوگوں کو ابھار کر کسی محاذ پر کھڑا کرتا ہے۔ کوئی تحریک خواہ بظاہر عوام کے نام پر اٹھی ہو، حقیقۃً وہ کچھ رہنماؤں کی اٹھائی ہوئی ہوتی ہے۔

کسی معاملہ کی نوعیت کو عوام نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صرف خواص ہیں جو اس کی واقعی نوعیت کو سمجھتے ہیں اور عوام کو رہنمائی دیتے ہیں۔ یہی رہنمائی کسی قوم کے مستقبل کے لیے فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اگر رہنما نے قوم کو صحیح رخ پر اٹھایا ہو تو وہ آخر کار اپنی منزل مقصود پر پہنچتی ہے۔ اور رہنما اگر قوم کو غلط رخ پر دوڑا دے تو ساری قربانیوں کے باوجود قوم تباہی کے گڑھے میں جا گرتی ہے۔ وہ پانے کے بجائے کچھ اور کھو دیتی ہے۔

کسی قوم کی عملی زندگی میں رہنما کا رول بے حد نازک ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ رہنما آخری حد تک سنجیدہ ہو۔ کیوں کہ اس نے اگر قوم کو غلط سمت میں دوڑا دیا تو اس کے بعد جو تباہی آئے گی اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ اسی رہنما پر ہو گی۔

دریا میں تیرنے کے لیے وہی آدمی اترتا ہے جو تیراکی کا فن جانتا ہو۔ اسی طرح رہنمائی کے میدان میں صرف اس شخص کو آنا چاہیے جس نے اس کی ضروری شرطوں کو پورا کیا ہو —— دین کا بخوبی علم، حالات موجودہ کا گہرا مطالعہ، قوم کی ایمانی اور اخلاقی حالت کا صحیح اندازہ، بیرونی طاقتوں کے بارہ میں کامل معلومات، اس قسم کے تمام ضروری پہلوؤں پر جس کو دستگاہ حاصل ہو اسی کو رہنمائی کے میدان میں اترنا چاہیے۔ اس کے بغیر رہنمائی کا کام سنبھالنا ایک جرم ہے نہ کہ کوئی رہنمائی۔

تعمیری طریقہ

سید منصور آغا دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 6927118) ان کا وطن میرٹھ ہے (پیدائش ۱۹۴۵)
یکم جولائی ۱۹۹۶ کی ملاقات میں انھوں نے اپنا ایک تجربہ بتایا جس میں ایک قیمتی سبق موجود ہے۔
۱۹۶۳-۶۴ میں وہ میرٹھ کالج کے طالب علم تھے۔ ان کے پولیٹکل سائنس کے استاد مسٹر کے سی گپتا تھے۔ ہندستان کی سیاسی تاریخ پر جب انھوں نے لکچر دینا شروع کیا تو یہ آغا صاحب کے لیے بہت پریشان کن ثابت ہوا۔ یہی حال ان کے ساتھی مستعین الرحمٰن صاحب کا تھا۔ مسٹر گپتا نے اپنے لکچر میں تقسیم اور سیاسی تاریخ کو اس طرح بتایا جس میں سارا الزام مسلمانوں پر آتا تھا۔ دونوں طالب علموں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں انھوں نے طے کیا کہ غصہ ہونے یا مشتعل ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم لوگوں کو اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ ہم مسٹر گپتا کی علمی کاٹ کر سکیں۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق، اب دونوں اپنا خالی وقت لائبریری میں گزارنے لگے۔ وہ ہندستان کی سیاسی تاریخ اور تقسیم ہند کے تاریخی ریکارڈ کا مطالعہ کرتے۔ اس طرح وہ پوری ذہنی تیاری کے ساتھ کلاس میں جانے لگے۔ انھوں نے یہ کیا کہ جب گپتا صاحب تاریخ کی کوئی غلط تعبیر پیش کرتے تو آغا صاحب اور ان کے ساتھی فوراً انھیں ٹوکتے اور پورے حوالہ کے ساتھ کہتے کہ آپ ایسا کیوں کر کہتے ہیں۔ فلاں کتاب میں تو یہ بات اِس طرح لکھی ہوئی ہے۔ اور فلاں مورخ نے تو اس کو اِس طرح بیان کیا ہے۔

کچھ دن ایسا چلتا رہا۔ آخر کار ایک دن مسٹر گپتا نے دونوں طالب علموں کو اپنے کمرہ میں بلایا۔ انھوں نے کہا کہ میرے دل میں تم لوگوں کی بہت قدر ہے۔ تم لوگوں نے میری تصحیح کر دی اور مجھے روشنی دکھائی۔ اس کے بعد مسٹر گپتا کے لکچر کا انداز بالکل بدل گیا۔ وہ آخر وقت تک دونوں مسلم طالب علموں کے ساتھ نہایت عزت کا سلوک کرتے رہے۔

اس طرح کے کسی مسئلہ کے حل کا یہی تعمیری طریقہ ہے۔ اور مسائل ہمیشہ تعمیری طریقہ سے حل ہوتے ہیں نہ کہ تخریبی طریقہ سے۔

عصری تقاضے

عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی کا زمانۂ حکومت ۱۸۷۶ سے ۱۹۰۹ تک ہے۔ اس نے ترکی میں ریفارم لانے کی کوشش کی۔ اس نے تعلیمی اصلاحات کا نفاذ کیا۔ تاہم بعض اسباب سے ملک میں اس کی شدید مخالفت ہوئی اور اس کو تخت سے معزول کر دیا گیا۔

قدیم زمانہ میں ترکی اپنے عظیم بحری بیڑے کے لیے مشہور تھا۔ مگر جب یورپ میں بھاپ کی طاقت دریافت ہوگئی اور بحری جہازوں کو اسٹیم انجن کے ذریعہ چلانے کا دور آیا تو ترکی اس میدان میں بہت پیچھے ہو گیا۔ مزید یہ کہ اس کا پچھڑاپن اس نوبت کو پہنچا کہ نئے طرز کی دخانی کشتیوں کو حاصل کرنا اور ان کو استعمال کرنا بھی ایک خطرناک فعل سمجھا جانے لگا۔

سلطان عبدالحمید ثانی پہلا شخص تھا جس نے بھاپ کی طاقت سے چلنے والا بحری بیڑہ (اُسطول) تیار کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ جب دخانی کشتیاں تیار ہوگئیں تو اس کے بعد وقت کے ترک علماء نے اصرار کیا کہ اس کو استعمال کرنے سے پہلے اس پر بخاری شریف کا ختم ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر کشتیوں کو سمندروں میں داخل کرنا ان کے نزدیک مخدوش تھا۔ علماء کا اصرار جب بہت بڑھا تو بعض ترک افسروں نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ بحری بیڑا بخار (بھاپ) سے چلتا ہے نہ کہ بخاری سے (اِنَّ الاُسطُولَ یسیرُ بالبخار لا بالبخاری)

بحری بیڑہ جیسے معاملات میں علماء کا دخل دینا بجائے خود جائز تھا۔ مگر علماء کو جاننا چاہیے تھا کہ اس کے لیے انھیں سب سے پہلے جدید تقاضوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھنا ہوگا۔ جدید دور کو سمجھے بغیر جدید معاملات میں دخل دینا ایک جرم ہے نہ کہ کوئی رہنمائی۔ مگر بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے علماء نے ہر جگہ یہی نادانی کی ہے۔ ترکی سے لے کر عرب تک اور ہند سے لے کر روس تک ہر جگہ اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

موجودہ زمانہ کے علماء نے دورِ جدید کا کوئی مطالعہ نہیں کیا۔ وہ عصری تقاضوں سے بالکل بے خبر تھے۔ ایسی حالت میں ان پر فرض تھا کہ وہ مسجد اور مدرسہ کے دائرہ میں اپنے آپ کو محدود رکھیں۔ مگر وہ اپنی حد پر نہیں رکے۔ ان کی نادانی کی چھلانگوں نے موجودہ زمانہ میں ملت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

تصور مذہب

مذہب کیا ہے۔ مذہب زندگی کا روحانی طریقہ ہے۔ یہ اپنے اندر کی دنیا کو دریافت کرنا ہے، وہ دنیا جہاں خدا اور بندے سے ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں فرشتوں کی مجلسیں قائم ہوتی ہیں۔ جہاں عالم بالا کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

مذہبی انسان باہر سے گزر کر اندر کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ مادی رونقوں سے گزر کر روحانی رونقوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ دنیا کے جلوؤں سے ہٹ کر آخرت کے جلوؤں کو دیکھنے لگتا ہے۔

غیر مذہبی انسان محدود دنیا میں جیتا ہے۔ لیکن مذہبی انسان اپنے جینے کے لیے ایک ایسی دنیا پالیتا ہے جس کی وسعتیں کبھی ختم نہ ہوں۔ غیر مذہبی انسان زندگی کی سطح پر جیتا ہے اور مذہبی انسان زندگی کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے۔

غیر مذہبی انسان شور کی آوازوں کو سمجھتا ہے، مذہبی انسان خاموش آوازوں کو سننے لگتا ہے۔

غیر مذہبی انسان خود پرست ہوتا ہے اور مذہبی انسان خدا پرست۔

غیر مذہبی انسان دنیا میں کانٹے کی طرح جیتا ہے، اور مذہبی انسان پھول کی طرح۔ غیر مذہبی انسان اگر تاریکی ہے تو مذہبی انسان روشنی۔ غیر مذہبی انسان اگر گرمی پھیلانے والا ہے تو مذہبی انسان ٹھنڈک بکھیرنے والا۔

جو فرق حیوان اور انسان میں ہے وہی فرق غیر مذہبی انسان اور مذہبی انسان میں ہے۔

غیر مذہبی انسان ناقابل پیشین گوئی کردار کی صفت رکھتا ہے اور مذہبی انسان مکمل طور پر قابل پیشین گوئی کردار کا حامل ہوتا ہے۔

غیر مذہبی انسان خود ساختہ راہوں میں چلتا ہے اور مذہبی انسان فطرت کی شاہراہ پر رواں دواں ہوتا ہے۔ غیر مذہبی انسان اس کائنات کا غیر مطلوب انسان ہے اور مذہبی انسان اس کائنات کا مطلوب انسان۔

سچا مذہبی انسان موجودہ دنیا میں بھی کامیابی حاصل کرتا ہے اور موت کے بعد آنے والی زندگی میں بھی۔

خدمت

کسی انسان کی انسانیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ دوسرے انسان کی خدمت کرے۔ وہ دوسرے انسانوں کی ضرورتوں میں ان کے کام آئے، وہ دوسرے انسانوں کو اپنے جیسا سمجھنے لگے۔

موجودہ دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کسی وجہ سے ضرورت مند ہو جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ دوسرے لوگ اسے سنبھالیں اور اس کی مدد کر کے دوبارہ اس کو باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنائیں۔

اعلیٰ انسان صرف اپنے معاملات کو درست کر کے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ وہ لازماً چاہتا ہے کہ دوسروں کے معاملات کو درست کرنے میں بھی وہ اپنا حصہ ادا کرے۔ خدمت اور انسانی مدد کا جذبہ خدا کو بہت پسند ہے۔ جو لوگ اپنے عمل سے اس کا ثبوت دیں وہ بلاشبہہ خدا کے محبوب بندے ہیں، آخرت میں خدا انھیں اپنی رحمت کے سایہ میں جگہ دے گا۔

انسانی خدمت کے بے شمار میدان ہیں۔ ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے گردوپیش کے لوگوں کو دیکھے اور جہاں جس خدمت کی ضرورت محسوس ہو وہاں وہ اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو استعمال کرے۔

انسانی خدمت کا یہ کام ہر ایک کو کرنا ہے۔ ایک شخص عملی طور پر دوسروں کا مددگار بن سکتا ہے تو وہ اپنے عمل سے دوسروں کو مدد پہنچائے۔ جو آدمی عملی مدد نہ کر سکتا ہو وہ اپنی زبان کو دوسروں کے حق میں استعمال کرے۔ وہ ان کو میٹھے بول کا تحفہ دے۔ جو آدمی اپنے آپ کو زبان سے خدمت کرنے کے قابل بھی نہ پائے وہ دل سے اس کی خیر خواہی کرے، وہ اپنی تنہائیوں میں اس کے لیے نیک دعائیں کرے۔

ہر انسان کو دوسرے انسانوں کا مددگار بننا ہے۔ ہر انسان کو دوسرے انسانوں کی خدمت کرنا ہے۔ دوسروں کو دینے کے لیے جو بھی اس کے پاس ہے، وہی اس سے مطلوب ہے، اور اسی کو اسے دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اسی کا نام خدمت خلق ہے۔

کائنات

کائنات کیا ہے۔ کائنات مطلوبات خداوندی کا مظاہرہ ہے۔ کائنات عمل کی زبان میں بتاتی ہے کہ خدا کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔

کائنات پوری کی پوری ایک ہی محکم قانون پر چل رہی ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ کائنات کا خدا صرف ایک خدا ہے، کائنات کے تمام اجزاء حد درجہ ہم آہنگی کے ساتھ اپنا اپنا عمل انجام دے رہے ہیں۔ یہ اس بات کا سبق ہے کہ انسان کو بھی اسی طرح پوری ہم آہنگی کے ساتھ زمین پر اپنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہیے۔

کائنات میں سورج چمک رہا ہے۔ یہ اس بات کا پیغام ہے کہ انسان دنیا میں روشنی دینے والا بنے نہ کہ اندھیرا پھیلانے والا۔ یہاں ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اِدھر سے اُدھر جا رہے ہیں۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ لوگوں کے درمیان سے گزرو تو ہوا کے نرم جھونکے کی طرح گزر جاؤ۔ یہاں ہر طرف پانی کے چشمے جاری ہیں۔ وہ اپنی نرم موسیقی میں کہہ رہے ہیں کہ تم بھی پانی کے نرم چشموں کی مانند رواں ہو جاؤ۔

کائنات میں درخت ہے جس سے لوگوں کو سایہ اور تراوٹ اور پھل اور پھول ملتا ہے۔ یہ اس بات کا فطری اعلان ہے کہ انسان کو بھی چاہیے کہ وہ بھی درخت جیسا مفید کردار اپنے اندر پیدا کر لے۔

کائنات میں ہر طرف بلا معاوضہ نفع رسانی کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ ایک فطری نمونہ ہے جو ایک ایک انسان کو بتا رہا ہے کہ وہ دوسرے انسان کے درمیان کس طرح بے غرض اور نفع بخش بن کر رہے۔

کائنات میں بے شمار چیزیں ہیں مگر ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ کائنات کا ہر جزء سرگرم ہے مگر وہ دوسرے سے نہیں ٹکراتا، یہ واقعہ بتاتا ہے کہ زمین پر انسان کو کس طرح رہنا چاہیے اور وہ ہے تنوع کے باوجود ہم آہنگ رہنا، سرگرمیوں کے باوجود ایک دوسرے سے نہ ٹکرانا۔

مناظر، داعی

مناظرہ ایک کرتب ہے اور دعوت ایک اسلامی عمل۔ مناظرہ ایک منفی کارروائی ہے اور دعوت ایک مثبت کارروائی۔ مناظر اپنے عمل سے اپنے آپ کو خوش کرتا ہے، داعی وہ ہے جو خدا کو خوش کرنے کے لیے اٹھے۔

مناظر کا طریقہ یہ ہے کہ مخاطب کے اندر کمزوریاں تلاش کرکے اس کی مذمت کرے اور اس طرح اس کے اوپر اپنی فتح کا جھنڈا گاڑے۔ اس کے مقابلہ میں داعی کا طریقہ یہ ہے کہ مخاطب کے اندر کوئی مشترک بنیاد تلاش کرکے اس سے قربت حاصل کی جائے اور پھر تدریج کے ساتھ اس کے فکر و عمل میں تبدیلی لانے کی کوشش کی جائے۔ مناظر صرف اپنی ذات کا خیر خواہ ہوتا ہے اور داعی اپنے ساتھ پورے معنوں میں مخاطب کا بھی خیر خواہ۔

مناظر اور داعی میں وہی فرق ہے جو وکیل اور مصلح میں ہوتا ہے۔ وکیل کا مقصد دوسرے کے اوپر برتری ہوتا ہے اور مصلح کا مقصد صرف دوسرے کی خیر خواہی۔ وکیل کا کام یہ ہے کہ وہ ایک فریق کے مقابلہ میں دوسرے فریق کو نیچا ثابت کرے۔ مصلح کا کام یہ ہے کہ وہ دلوں میں اتر کر لوگوں کو آمادہ کرے کہ وہ اپنی درستگی کی فکر کریں اور اپنے معاملات کو بہتر بنالیں۔

مناظرہ اور ڈِبیٹ اپنی ذات میں خود ایک برائی ہے۔ جب کہ دعوت کا مقصد یہ ہے کہ برائیوں کو حکیمانہ تدبیروں سے دور کیا جائے۔ مناظرہ بازی ماحول کے اندر فکری آلودگی پیدا کرتی ہے، اور دعوت و تبلیغ سے لوگوں کے درمیان صفائی اور پاکیزگی کا ماحول قائم ہوتا ہے۔ مناظرہ تاریکی میں مزید تاریکی کا اضافہ ہے۔ دعوت تاریکی میں روشنی کا چراغ روشن کرنا ہے۔ مناظرہ بازی لوگوں کے دماغوں میں منفی رجحانات کی پرورش کرنے والی ہے جبکہ دعوت و تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی داخلی دنیا میں مثبت سوچ کی بہار آجائے۔

مناظرہ کھلے ہوئے دروازوں کو بند کرنے والا ہے اور دعوت کا عمل بند دروازوں کو کھولنے والا۔ مناظرہ صرف مناظر کی اپنی ذات کو فائدہ پہنچاتا ہے، جبکہ دعوت خود مدعو کی زندگی میں فائدوں کی بہار لے آتی ہے۔

مناظرہ اسلام میں ایک اجنبی چیز ہے، جبکہ دعوت سراپا اسلام کا ایک مطلوب عمل۔

سماجی ذمہ داریاں اور صحافت

Social Responsibilities and Media

آج کی اس میٹنگ کا موضوع بحث ہے۔ صحافت اور سماجی ذمہ داریاں۔ اس موضوع کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو شاید اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح آج کل ہمارے ملک میں جوڈیشیل ایکٹوزم زوروں پر چل رہا ہے، اسی طرح ضرورت ہے کہ اسی کے ساتھ یہاں ایک میڈیا ایکٹوزم بھی جاری کر دیا جائے۔ یہ بلا شبہ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔ اور بعض دوسرے ملکوں میں اس کے کامیاب تجربے بھی کیے گئے ہیں۔ آج ہمیں سوچنا ہے کہ ہم اپنے ملک میں اس آئیڈیا کو کس حد تک واقعہ بنا سکتے ہیں۔

اگرچہ جس طرح جوڈیشیل ایکٹوزم کی کچھ محدودیتیں (limitations) ہیں اسی طرح میڈیا ایکٹوزم کی بھی کچھ محدودیتیں ہیں۔ تاہم محدودیت موجودہ دنیا کا ایک عام قانون ہے۔ کوئی بھی ادارہ اس سے بچا یا ہوا نہیں۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ یا پولیٹکل پاور جس کو بظاہر کسی سماج کا سب سے زیادہ طاقتور ادارہ سمجھا جاتا ہے اس کی بھی محدودیتیں ہیں۔ ایک حد پر جا کر پولیٹکل پاور کا اختیار اسی طرح ختم ہو جاتا ہے جس طرح دوسرے تمام سماجی اداروں کا۔

اس لیے زیادہ بڑھی ہوئی توقع (over-expectation) میں پڑے بغیر ہم کو حقیقت پسندانہ انداز میں یہ جائزہ لینا ہے کہ سماج سدھار کے لیے میڈیا ایکٹوزم کی کیا اہمیت ہے اور اس کو کس طرح یہاں جاری کیا جا سکتا ہے۔

---

۲۰ جولائی ۱۹۹۶ کو نئی دہلی (گاندھی پیس فاؤنڈیشن) میں دانش وروں اور صحافیوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس کا موضوع بحث تھا: میڈیا اور اس کی سماجی ذمہ داریاں۔ یہ مقالہ اس موقع پر کی نوٹ ایڈرس کے طور پر پیش کیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ پریس ایک انڈسٹری ہے ۔ والٹر پٹکن نے کہا کہ جس گاڑی بنانے والا گاڑی بنا کر نقل وحمل کو فروخت کرتا ہے ٹھیک اسی طرح اخبار کا مالک معلومات کو فروخت کرتا ہے، اخبار نہ تو نصیحت ہے اور نہ پروپیگنڈا :

Just as it is the automobile manufacturer's business to sell transportation, so it is the newspaper owner's business to sell information and not advice nor propaganda.

اصولی طور پر میں اس کو درست سمجھتا ہوں ۔ یہ غیر حقیقت پسندانہ بات ہوگی کہ اخبارات کو ریفارمر یا مارل ٹیچر کے معیار پر جانچا جائے ۔ تاہم بات اتنی سادہ نہیں ہے ۔ اس دنیا میں کسی چیز کو دوسری چیز سے مکمل طور پر الگ نہیں کیا جاسکتا ۔ کیوں کہ یہاں چیزیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں ۔ اگر براہِ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر ایک چیز کا اثر دوسری چیز پر پڑتا ہے ۔

جس طرح ڈاکٹر مریض کو ایک دوا دیتے ہوئے یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کا کوئی سائڈ ایفکٹ تو نہیں ۔ اسی طرح اخبار کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کو انڈسٹری کے اصول پر چلاتے ہوئے یہ بھی دیکھا جائے کہ سماج کے اوپر اس کا کوئی برا اثر تو نہیں پڑے گا ۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کی صحافت اس ضروری شرط کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہے ۔

ہماری موجودہ صحافت میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ وہ عمومی خبر رسانی کے اصول پر نہیں چلائی جاتی بلکہ منتخب خبر رسانی (selective reporting) کے اصول پر چلائی جاتی ہے ۔ اس صحافتی اصول کو اس مشہور فقرہ میں بتایا گیا ہے کہ کتا آدمی کو کاٹے تو خبر نہیں لیکن آدمی کتے کو کاٹے تو وہ خبر ہے :

When a dog bites a man it is no news,
but when a man bites a dog, then it is news.

اسی بنا پر ایسا ہوا ہے کہ ہمارے اخبارات کے نزدیک گرم خبر (hot news) تو خبر ہے ۔ لیکن جن خبروں میں گرمی اور سنسنی خیزی نہ ہو ان کو وہ اس طرح نظرانداز کر دیتے ہیں جیسے کہ وہ خبر ہی نہیں ۔ گویا بری خبریں نیوز وردی ہیں اور اچھی خبریں نیوز وردی نہیں ۔ اس انتخابی خبر رسانی نے ہمارے سماج کو شدید نقصان پہنچایا ہے ۔

میں ایک مثال دیتا ہوں ۔ کچھ عرصہ پہلے غالب اکیڈمی میں ایک جلسہ تھا ۔ رام پور کے مسٹر طارق

نے اپنی تقریر میں کہا کہ جب میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا تو اپنے ایک کلاس فیلو مسٹر اشوک سے میری دوستی ہوگئی۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر جانے لگے۔ ایک عرصہ تک دیکھنے کے بعد میرے گھر کی بوڑھی خاتون نے کہا: اشوک تو اتنا ہی اچھا ہے جتنا طارق۔ ٹھیک یہی واقعہ اشوک کے گھر میں ہوا۔ ایک عرصہ کے بعد ان کے گھر کی بوڑھی خاتون نے کہا: طارق تو اتنا ہی اچھا ہے جتنا اشوک۔

یہ کوئی ایک واقعہ نہیں۔ تقریباً ہر مسلمان اور ہر ہندو اپنے روزمرہ ملنے والے کے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتے ہیں۔ انفرادی سطح پر ہر ہندو اپنے ملاقاتی مسلمان کو اچھا سمجھتا ہے۔ اسی طرح ہر مسلمان اپنے ملاقاتی ہندو کو اچھا خیال کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ طارق اور اشوک کے گھروں میں جو جملہ ایک ہندو فرد اور ایک مسلمان فرد کے بارے میں کہا گیا وہی جملہ دونوں طرف پوری کمیونٹی کے بارے میں کیوں نہیں کہا جاتا۔ دونوں فرقوں میں یہ الفاظ کیوں نہیں سنائی دیتے کہ مسلمان لوگ تو اتنے ہی اچھے ہیں جیسے ہندو یا ہندو لوگ تو اتنے ہی اچھے ہیں جیسے مسلمان۔

اس کی وجہ بہت سادہ ہے۔ انفرادی سطح پر ایک ہندو یا ایک مسلمان جب ایک دوسرے کو جانتے ہیں تو وہ براہِ راست انٹرایکشن کے ذریعہ جانتے ہیں۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کا مکمل تعارف حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس کمیونٹی کی سطح پر تعارف کا ذریعہ ہمارے اخبارات ہیں۔ ملکی اور قومی سطح کے واقعات کو ہم صرف اخباروں کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں۔ نہ کہ براہِ راست میل جول کے ذریعہ۔

اب چونکہ اخباروں میں سلکٹیو رپورٹنگ کا طریقہ رائج ہے۔ اس لیے عملاً یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں صرف جزئی حالات سے باخبر ہوتے ہیں۔ ہندو جب اخبار پڑھتا ہے تو اس میں وہ مسلم فرقہ کی صرف "ھاٹ نیوز" سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح مسلمان جب اخبار پڑھتا ہے تو وہ ہندو فرقہ کی صرف "ھاٹ نیوز" سے باخبر ہوتا ہے۔ اس طرح دونوں طرف غیر حقیقی ذہن بنتا رہتا ہے۔ ہندو سمجھتا ہے کہ مسلم فرقہ تو ایسا اور ایسا ہے، دوسری طرف مسلمان سمجھتا ہے کہ ہندو فرقہ ایسا اور ایسا ہے۔ فرقوں کے بارے میں لوگ صرف بری خبروں کو جانتے ہیں وہ ان کی اچھی خبروں سے سرے سے واقف ہی نہیں ہوتے۔

یہی اس سماجی تضاد کا اصل سبب ہے کہ ایک ہی ملک میں ہندو اور مسلمان انفرادی طور پر

ایک دوسرے کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں اور اسی ملک میں کیمونٹی کی سطح پر وہ ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور تعصب کا شکار ہیں۔ اس نے ملک کو ناقابل بیان نقصان سے دوچار کیا ہے۔

اگر ہم ہندستان میں بہتر سماج یا سچے میل ملاپ والا سماج بنانا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم اس تضاد کو ختم کر دیں۔ ہمارے اخبارات سماجی حالات کی مکمل رپورٹنگ کریں۔ وہ سماجی طبقوں کے بارے میں ایک دوسرے کی پوری تصویر دکھائیں۔ اور جب پوری تصویر سامنے لائی جائے گی تو یقینی طور پر وہی ہوگا جو آج بھی انفرادی سطح پر موجود ہے۔ جس طرح آج ہزاروں افراد ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اشوک تو اتنا ہی اچھا ہے جتنا طارق یا طارق تو اتنا ہی اچھا ہے جتنا اشوک۔ اسی طرح آیندہ ہمارے کان یہ الفاظ بھی سننے لگیں گے کہ ہندو لوگ تو اتنے ہی اچھے ہیں جتنے مسلمان۔ اور مسلمان لوگ تو اتنے ہی اچھے ہیں جتنے ہندو۔ اور پھر ہمارے سماجی مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

اب اس معاملہ کے دوسرے پہلو کو لیجئے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اخبارات انفارمیشن فروخت کرنے کی تجارت ہیں۔ مگر یہاں بھی ہمارے ملک کے اخبارات ایک زبردست کوتاہی کا شکار ہیں۔ کچھ برس پہلے یورپ کا ایک اعلیٰ صحافتی وفد دہلی آیا۔ اس نے اخبارات کو دیکھ کر کہا تھا کہ انڈیا کے اخبارات تو ابھی تک اس صحافتی طرز پر چلائے جارہے ہیں جو ہمارے یہاں انیسویں صدی میں رائج تھا۔ مگر اب وہاں وہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اس نے کہا کہ پہلے ہمارے اخبارات پر سیاسی خبریں چھائی رہتی تھیں۔ مگر اب ہمارے یہاں سیاسی خبریں نمبر ۲ پر جا چکی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں قومی اور سماجی اہمیت کی خبریں نمبر ایک پر آگئی ہیں۔

یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ ہمارے اخبارات ابھی تک اس پس ماندگی کا شکار ہیں۔ مغرب کی ترقی یافتہ صحافت کے مقابلہ میں وہ تقریباً سو سال پیچھے ہیں۔ ہمارے اخبارات کے اسی ذوق کا یہ نتیجہ ہے کہ آج آپ ملک کے کسی گوشہ میں جائیں تو ہر جگہ لوگوں کو سب سے زیادہ سیاسی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے پائیں گے۔ یہ کوئی صحت مند علامت نہیں۔ صحت مند بات یہ ہے کہ لوگوں کو علمی، سائنسی اور تمدنی معلومات ملیں اور لوگ ان پر بحث و گفتگو کریں۔

اس صحافتی ذوق کے جو نقصانات ہیں ان کی ایک مثال انٹرنیٹ (Internet) کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ انٹرنیٹ کی ابتدا تقریباً ۲۵ سال پہلے ۱۹۷۲ میں ہوئی۔ برسوں پہلے دنیا کے ڈیڑھ سو سے زیادہ ملک اس سے جڑ گئے۔ وہ اس سے زبردست فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ مگر ہندستان میں انٹرنٹ کا آغاز ابھی صرف اگست ۱۹۹۵ میں ہو سکا۔ آج بھی وہ اس معاملہ میں سنگاپور اور کوریا جیسے چھوٹے ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔

انٹرنٹ جیسی مفید چیز کے معاملہ میں ہندستان کے اس پچھڑے پن کا ذمہ دار کون ہے۔ غالباً یہ ہمارے اخبارات ہی ہیں جو اس پچھڑے پن کے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ انھوں نے ہندستانی سماج کو انٹرنٹ کے معاملہ میں باخبر نہیں بنایا۔ اس معاملہ میں انھوں نے ہندستانیوں کو ایجوکیٹ نہیں کیا۔ اسی لیے لوگ نہ بروقت اس کے فوائد کو سمجھ سکے اور نہ سماجی سطح پر اس کی مانگ پیدا ہوئی۔

اس لیے میں کہوں گا کہ ہمارے اخبارات کو پورے معنی میں معلومات کا تجارتی ادارہ بننا چاہیے۔ انھیں پولیٹکل obsession سے نکلنا چاہیے جس طرح مغربی ملکوں کے اخبارات اس سے نکل کر باہر آچکے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اخبار کو وسیع تر انسانی شعبہ کی حیثیت سے چلائیں۔ وہ سیاسی خبروں کے حصہ کو گھٹائیں۔ اور اس کے بجائے علمی، سائنسی اور جدید ترقیاتی معلومات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں اور اس قسم کے مضامین اور تبصرے زیادہ سے زیادہ شائع کریں۔ وہ ہندستانی معاشرے کو ایک سائنسی معاشرہ بنانے میں اپنا حصہ ادا کریں۔

ہندستان میں بڑے پیمانہ پر اسٹرکچرل تبدیلیاں کی گئی ہیں ——— ۱۹۴۷ میں آزادی کا انقلاب، ۱۹۵۰ میں سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی بنانے کا فیصلہ، قومی حکومتوں کے قیام کے بعد ہزاروں اصلاحی قوانین کا پاس کیا جانا۔ اسی طرح ۱۹۷۷ کا ٹوٹل ریولیوشن، وغیرہ۔ مگر یہ تمام تبدیلیاں یکسر بے فائدہ ثابت ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسٹرکچرل چینج کے نتیجہ خیز بننے کے لیے انٹلکچول چینج کی زمین درکار ہے۔ یہ فکری زمین سب سے زیادہ اخبارات بنا سکتے تھے، انھوں نے یہ کام کیا نہیں۔ اسی لیے تمام اسٹرکچرل تبدیلیاں بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ ہمارا اخباری ادارہ اپنی رپورٹوں، اپنے فیچرس اور اپنے مضامین کے ذریعہ اس تعمیری ذمہ داری کو ادا کرے تاکہ ہمارا مستقبل ہمارے حال سے بہتر ثابت ہو۔

میڈیا فورم (Media Relations Forum) جس کے تحت یہ میٹنگ کی گئی ہے وہ اسی صحافتی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہمارے ملک میں بہت سی صحافتی تنظیمیں موجود ہیں۔ مگر وہ زیادہ تر حقوق   کے حصول کے لیے بنائی گئی ہیں۔ مگر میڈیا ریلیشنز فورم خصوصی طور پر صحافتی ذمہ داریوں کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے وہ خود صحافیوں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں ہر جگہ بڑی بڑی تنظیمیں قائم ہیں جو صحافت کی سماجی ذمہ داریوں (Social responsibilities) کے اصول پر مبنی ہیں۔ اور انھوں نے ان ملکوں میں صحافت کو سماجی اعتبار سے مفید بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ موجودہ تنظیم اسی نوعیت کی ایک طاقتور صحافتی تنظیم ثابت ہوگی۔ وہ اس بات کی ایک ضمانت ہوگی کہ ہمارا صحافتی شعبہ اپنی سماجی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ وہ سماج سے لینے کے ساتھ سماج کو دینے والا ادارہ بن جائے۔

تاہم میرا خیال ہے کہ اس قسم کی صحافتی تنظیم بنانا ہی اس مسئلہ کے حل کے لیے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ موجودہ صحافت کا پورا نشو ونما اصلاً معلوماتی صحافت (informative journalism) کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اب بظاہر یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کو اچانک ناصحانہ صحافت (suggestive journalism) میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس لیے یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ بات ہوگی کہ ہم یہ امید کریں کہ موجودہ صحافت کو ناصحانہ صحافت کے اصول پر چلایا جا سکتا ہے۔

مگر میرا تجربہ ہے کہ ایک صورت اور ہے جو موجودہ ڈھانچہ ہی میں ممکن ہے اور وہ پوری طرح مفید بھی ہے۔ وہ ہے صحافت کے ساتھ سوشل ورکرس کا تعاون۔ اگر ایسا ہو کہ سوشل ورکرس اور ریفارمرس اخباروں سے ربط رکھیں اور حسب ضرورت انھیں سماجی اہمیت والے امور کی طرف متوجہ کرتے رہیں تو مذکورہ مقصد بڑی حد تک حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ذاتی طور پر کئی کامیاب مثالیں مجھے معلوم ہیں۔ مثلاً ۱۹۹۳ کے شروع میں جب کہ ملک کے مختلف حصوں میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، پونہ میں ایک روز صبح کو یہ افواہ پھیل گئی کہ رات کو کچھ مسلمان فلاں مندر میں گھسے اور انھوں نے وہاں رکھی ہوئی مورتیوں کو توڑ ڈالا۔ اس کے فوراً بعد کچھ سماجی کارکن شہر کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اخبار کے ایڈیٹر سے ملے۔

یہ ایک ساوتھ انڈین تھے۔ مشورہ کے بعد ایڈیٹر نے فوراً اپنی ٹیم بھیج کر تحقیق کرائی۔ معلوم ہوا کہ مذکورہ مندر بالکل ٹھیک حالت میں ہے۔ وہاں کسی قسم کی کوئی توڑ پھوڑ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے فوراً ایک رپورٹ بنائی اور شام کے سپلیمنٹ میں اس کو چھاپ دیا۔ جب لوگوں نے اخبار کی رپورٹ کو پڑھا تو تناؤ اپنے آپ ختم ہو گیا اور پونہ شہر بھیانک فساد سے بچ گیا۔

اسی زمانہ میں الور (راجستھان) کے ایک ہندی اخبار میں ایک خبر چھپی کہ فلاں گاؤں کے میو مسلمان ہتھیار جمع کر رہے ہیں اور وہ الور شہر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مسجد کا نام بھی چھاپ دیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں الور میں تناؤ پیدا ہو گیا اور بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ جلد ہی فساد پھوٹ پڑے گا۔ دوبارہ کچھ سماجی کارکن فوراً حرکت میں آ گئے۔ انھوں نے الور کے چار ہندی اخباروں کے دفتر سے ربط قائم کیا۔ اور ان کے نمائندوں کو لے کر مذکورہ گاؤں میں پہنچے۔ وہاں گھر گھر جا کر لوگوں سے ملے۔ مذکورہ مسجد میں داخل ہو کر اس کو اچھی طرح دیکھا۔ مگر وہاں نہ کوئی ہتھیار تھا اور نہ اس قسم کی کوئی اور چیز۔ اس کے بعد چاروں اخباروں نے اپنے نمائندوں کے حوالے سے تفصیلی رپورٹ چھاپ دی۔ اس کو پڑھتے ہی اپنے آپ لوگوں کے جذبات ٹھنڈے ہو گئے اور شہر میں فساد ہونے سے رہ گیا۔

موجودہ حالات میں یہی سب سے زیادہ مفید اور قابل عمل طریقہ ہے۔

پونہ کا سفر

پونہ کے ایک بڑے سائنسی ادارہ ایم آئی ٹی کے زیر انتظام پونہ میں ایک بین اقوامی کانفرنس ہوئی جو ۲۴ نومبر سے یکم دسمبر ۱۹۹۶ تک جاری رہی۔ اس کانفرنس کا نام ورلڈ فلاسفر میٹ تھا۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے پونہ کا سفر کیا۔ ذیل میں اس کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۳ نومبر ۱۹۹۶ کی شام کو دہلی سے انڈین ایر لائنز کی فلائٹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز مکمل طور پر بھرا ہوا تھا جب کہ ہر دن بہت سے لوگ ٹرینوں اور بسوں کے ذریعہ بھی دہلی سے پونہ کا سفر کرتے ہیں۔ جدید وسائل سفر سے پہلے دہلی اور پونہ کے درمیان روزانہ ایک آدمی کے سفر کا اوسط بھی نہیں ہوگا مگر آج دونوں شہروں کے درمیان ہزاروں آدمی روزانہ آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ یہ صنعتی انقلاب کا نتیجہ ہے۔ صنعتی انقلاب نے زندگی کے نقشہ میں جو تبدیلیاں کی ہیں اس کا ایک پہلو انسانی اختلاط میں غیر معمولی اضافہ ہے۔ اس طرح جدید دور نے دعوت کے امکانات کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ مگر جن لوگوں کو ان جدید دعوتی مواقع کو استعمال کرنا تھا وہ ان سے باخبر ہی نہ ہو سکے، پھر وہ ان کو استعمال کس طرح کرتے۔

دو گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز پونہ کے ہوائی اڈہ پر اترا وہاں کانفرنس کے نمائندوں کے علاوہ حلقۂ الرسالہ کے افراد بھی موجود تھے۔ ایر پورٹ پر کچھ وقت گزارنے کے بعد ہمارا قافلہ شہر کی طرف روانہ ہوا۔ یہاں میرا قیام اسپیش پلازہ (روم ۷۰۴) میں تھا۔ یہ ہوٹل تاریخی فرگوسن کالج کے عین سامنے واقع ہے اور نہایت صاف ستھرا ہے۔ ہوٹل کا عملہ بھی مستعد نظر آیا۔

پونہ کی یہ فلسفیانہ کانفرنس مہاراشٹر کے ایک قدیم فلسفی شاعر جنانیشور (۱۲۹۶-۱۲۷۴) کے نام پر کی گئی تھی۔ دوسری کتابوں کے علاوہ انھوں نے گیتا کی ایک شرح مراٹھی زبان میں لکھی تھی جس کا ترجمہ یونیسکو کی طرف سے انگلش، فرنچ، اسپینش میں کیا جا رہا ہے۔ یہ بات کانفرنس میں بتائی گئی۔

۲۴ نومبر کو کانفرنس کے افتتاح کا دن تھا۔ ایک وسیع پنڈال میں دلائی لامہ نے اس کا افتتاح کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اس پر زور دیا کہ لوگ اپنے کٹرپن کو ختم کریں اور مل جل کر امن کے ساتھ زندگی گزاریں۔

چند دوسری شخصیتوں کے علاوہ میری بھی ایک تقریر اس افتتاحی پروگرام میں رکھی گئی تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آزادی کے بعد ہندستان مطلوب ترقی حاصل نہ کرسکا اس کی واحد وجہ کردار کی کمی ہے۔ اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ملک کے اندر کردار سازی کی مہم چلائی جائے۔ کوئی بھی دوسری ترقی کردار کا بدل نہیں بن سکتی۔

کانفرنس کے آغاز میں اسکول کے بچے اپنے مخصوص یونیفارم میں قطار در قطار اسٹیج کے سامنے سے گزرے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں تمام دنیا کے ملکوں کے جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے اور عالمی اتحاد کے گیت گارہے تھے۔ یہ ایک دلکش منظر تھا میں نے سوچا کہ گیت اور جھنڈے کی سطح پر عالمی اتحاد کا مظاہرہ کتنا آسان ہے۔ اس کے مقابلہ میں حقیقی زندگی کی سطح پر عالمی اتحاد حاصل کرنا کتنا زیادہ مشکل۔

یہ کانفرنس ۲۴ نومبر سے لے کر ۳۰ نومبر ۱۹۹۶ تک جاری رہی۔ ہر روز مختلف مذاہب اور مختلف فلسفیانہ اسکول پر الگ الگ اجلاس ہوتے رہے۔ اس کانفرنس میں تقریباً ایک ہزار ڈیلی گیٹ شریک تھے جس میں ہندستان کے علاوہ بیرونی ملکوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ یہ تمام ڈیلی گیٹ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

میں اپنے ذوق کے مطابق روزانہ کسی ایک اجلاس میں شریک ہوتا رہا۔ چند مواقع پر مختصر طور پر اپنی رائے کا بھی اظہار کیا۔ اس کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگوں سے انفرادی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس طرح انفرادی گفت گو کی صورت میں مختلف ملکوں، مختلف مذاہب اور مختلف فلسفیانہ اسکول کے لوگوں سے تبادلۂ خیال جاری رہا۔

۲۵ نومبر کو ایک پورا سیشن اسلام کے موضوع پر رکھا گیا تھا۔ اس سیشن کا صدر مجھ کو بنایا گیا۔ مجھے اس سیشن میں تقریر کرنے کے لیے یہ موضوع دیا گیا تھا —— اسلام کا فلسفۂ امن : (The Philosophy of peace in Islam) اس سیشن میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ یہاں ہر مقرر کو بیس منٹ کا وقت دیا جاتا تھا۔ مگر ہر مقرر نے زیادہ وقت لے لیا۔ آخر میں یہ ہوا کہ ایک خاتون جو پروگرام کو کنڈکٹ کررہی تھیں انھوں نے مجھ سے کہا کہ اب آپ کے لیے صرف دو منٹ باقی ہیں۔ میں نے کسی ناراضگی کے بغیر دو منٹ میں اپنی بات ختم کردی۔ میں نے جیسے ہی اپنی تقریر ختم کی

فوراً کانفرنس کے ذمہ داران (ڈاکٹر بار لنگے، پروفیسر کراڑ وغیرہ) اسٹیج کے پاس آگئے۔ اور کہنے لگے کہ اتنا مختصر کیوں۔ ہم تو آپ کی تقریر تفصیل کے ساتھ سننا چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب یہ خاتون دیں گی۔ خاتون نے بتایا کہ مجھے سیشن کو مقرر وقت پر ختم کرنا تھا اور دوسرے مقررین کی لمبی تقریروں کی وجہ سے مزید وقت باقی نہیں تھا۔

اس سیشن کے فوراً بعد دوسرا سیشن تھا جو جین دھرم کے لیے خاص کیا گیا تھا۔ منتظمین نے فوری طور پر پروگرام میں تبدیلی کرتے ہوئے مجھے اگلے سیشن میں بولنے کا موقع دیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ دوبارہ تیس منٹ تک اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ چنانچہ میں نے اس کے فوراً بعد اپنے مقرر موضوع اسلام میں فلسفۂ امن پر اپنی تقریر شروع کی۔ اس تبدیلی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ حاضرین کی تعداد کافی بڑھ گئی، کیوں کہ جین مذہب کو سننے کے لیے مزید کافی لوگ وہاں آگئے تھے۔

اس کانفرنس میں بیرونی ملکوں (یورپ، امریکہ وغیرہ) کے لوگ بھی موجود تھے چنانچہ اس کی تمام کارروائی مکمل طور پر انگریزی میں ہو رہی تھی۔ میں نے بھی اپنی تقریر انگریزی میں کی۔ آخر میں پہنچ کر جب میں نے کہا کہ :

In the end, I would like to add

فوراً پروفیسر کراڑ جو کہ کانفرنس کے منتظم اعلیٰ تھے اٹھ کر میرے پاس آئے اور کہا کہ دس منٹ اور، چنانچہ میں مزید دس منٹ تک بولا۔ اس طرح میری تقریر چالیس منٹ تک جاری رہی۔

پروگرام کے بعد کئی دن تک لوگ مجھ سے ملتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ آپ کی تقریر بہت پسند آئی۔ اس میں بہت زیادہ وضوح (clarity) تھا۔ آپ کی ہر بات دل میں اترتی جارہی تھی۔ ایک ہندو پروفیسر نے کہا کہ آپ ہی کی تقریر پورے کانفرنس کا حاصل تھی۔ پروفیسر کراڑ نے کئی بار لوگوں کے سامنے کہا "مولانا صاحب کی آواز میں اللہ بولتا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کئی بار کہا کہ مجھے آپ کی آواز بہت پسند ہے۔ مجھے آپ کی آواز میں کیسٹ چاہیے۔

ایک ڈبلی گیرٹ نے اپنی پوری تقریر میں مذاہب کے اتحاد پر زور دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ تمام مذاہب سچے ہیں اور سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں :

All religions are true and equal

میں نے کانفرنس کے بعض افراد سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات بظاہر خوب صورت معلوم ہوتی ہے مگر اس کی کوئی عملی معنویت نہیں۔ دوسرے تمام معاملات میں سچائی صرف ایک ہوتی ہے۔ پھر مذہب کے معاملہ میں ایسا کیوں کر ممکن ہے کہ ہر چیز سچی ہو جائے۔ صداقت بلاشبہہ ایک ہے۔ البتہ سماجی زندگی کے نظام کو بحسن وخوبی چلانے کے لیے ہر ایک کو دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔

ایک صاحب نے اپنے مقالہ میں کہا کہ ویدوں کا یہ کہنا ہے کہ سچائی ایک ہے، مگر اہل دانش اس کو مختلف طریقہ سے بیان کرتے ہیں :

Truth is One; Wise speak of it in many ways.

یہ بات عام طور پر اس طرح دہرائی جاتی ہے جیسے کہ وہ سائنٹفک فیکٹ کی طرح کوئی ثابت شدہ چیز ہو۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں دو سوالات بہت بنیادی ہیں جن کا جواب ابھی نہیں دیا گیا ہے۔

۱۔ کہنے والے کا استناد (authenticity) کیا ہے۔

۲۔ جب کہنے والا آج زندہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کے نام سے صرف کچھ کتابیں موجود ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان کتابوں کی تاریخی اعتباریت (historical credibility) کیا ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے ابھی تک ان دونوں سوالوں کا کوئی معتبر جواب نہیں دیا گیا ہے۔ اور جب تک ان دونوں سوالوں کا معتبر جواب نہ دیا جائے مذکورہ بیان کی صداقت غیر ثابت شدہ رہے گی۔

یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں ایک سادھو تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے اپنے خاص انداز میں کہا : یہ دونوں آنکھیں تو کیمرہ ہیں باہر دیکھنے کے لیے۔ بھیتر کو تو آنکھیں بند کر کے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ بات مجھے پسند آئی۔ یہ صحیح ہے کہ آنکھیں صرف بیرونی چیزوں ہی کو دیکھ پاتی ہیں۔ اندر چھپی ہوئی حقیقتوں کو دیکھنے کے لیے بصیرت درکار ہے نہ کہ صرف بصارت۔ تاہم یہ بات مطلق معنوں میں صحیح نہیں۔ کیونکہ آنکھ سے دیکھی ہوئی چیزوں کی حیثیت ڈاٹا (data) کی ہے۔ آنکھیں گویا باہر سے

ڈاٹا اکٹھا کر کے اندرونی بصیرت کو فراہم کرتی ہیں پھر بصیرت اس جمع شدہ ذخیرۂ معلومات کی مدد سے گہرے نتائج تک پہنچتی ہے۔ اگر آنکھ کا مشاہداتی عمل رک جائے تو اندرونی بصیرت کا عمل ختم تو نہ ہوگا البتہ بہت زیادہ محدود ہو جائے گا۔

اس کانفرنس میں بہت بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ ہندو شریک تھے۔ کئی ہندوؤں نے اپنے مخصوص ذوق کے مطابق یہ بات کہی کہ سب دھرم ایک ہیں۔ لوگ ناحق مذہب کے نام پر آپس میں لڑتے ہیں۔ اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مذہبی اختلاف کا حل یہ نہیں ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ سب مذہب ایک ہیں۔ اس کا حقیقی حل یہ ہے کہ ٹالرنس پر زور دیا جائے۔ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ اختلاف زندگی کا ایک حصہ ہے نہ صرف مذہب میں بلکہ ہر معاملہ میں اختلافات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں پر امن سوسائٹی بنانے کا راز یہ ہے کہ لوگ اپنے عقیدے کو مانتے ہوئے دوسرے کا احترام کریں۔ گویا کہ اس مسئلہ کا حل باہمی اعتراف (mutual recognition) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔

پونہ کی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں سے ایک پٹنہ کے ڈاکٹر احسان اشرف (Tel. 368037) بھی تھے۔ ان کا مضمون فلسفہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں اقبال کے فلسفہ پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔

میں نے کہا کہ اقبال کو فلسفی کہنا بذاتِ خود درست نہیں۔ اگر آپ اقبال کی اس کتاب (The Reconstruction of religious thought in Islam) کی بنا پر ان کو فلسفی کہیں تو میں کہوں گا کہ وہ فلسفہ کی کتاب نہیں ہے بلکہ علم کلام کی کتاب ہے۔ اور فلسفہ اور علم کلام میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اور اگر آپ اقبال کے اشعار کی بنا پر ان کو فلسفی کہیں تو یہ اور بھی زیادہ عجیب ہے کیونکہ فلسفہ ایک انتہائی سنجیدہ نظامِ فکر کا نام ہے اور کسی سنجیدہ نظام فکر کو کبھی بھی درست طور پر شاعری کے ذریعہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ان سے دو دن ملاقات ہوئی پہلے دن وہ اس موضوع پر دیر تک اختلافی بحث کرتے رہے مگر جب اگلے دن ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں آپ کی بات پر غور کرتا رہا اور آخر میں یہ سمجھ میں آیا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ اقبال کو فلسفی کہنے کے لیے سب سے پہلے خود فلسفہ کی تعریف کو بدلنا ہوگا۔

فلسفہ کیا ہے ؛ فلسفہ دراصل حقیقت کے عقلی اور منطقی مطالعہ کا نام ہے۔ فلسفی اور سائنسداں میں یہ فرق ہے کہ سائنس داں فطرت کے قانون کو اصولی طور پر بطور واقعہ تسلیم کر کے اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں فلسفی کسی بھی چیز کو پیشگی طور پر واقعہ نہیں مانتا۔ وہ آزادانہ عقلی جستجو کے ذریعہ آخری حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے :

Philosophy is a logical and rational analysis of principles underlying the ultimate nature of the universe, and related fields.

کچھ لوگ اسلام کو ایک فلسفہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام فلسفہ کے مشابہ علم نہیں ہے بلکہ سائنس کے مشابہ ایک علم ہے۔ اسلام میں حقیقت کا مطالعہ آزادانہ عقلی جستجو کے ذریعہ نہیں کیا جاتا جیسا کہ فلسفہ میں ہوتا ہے۔ بلکہ وحی کو مان کر اس کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اسلام کا یہ طریقہ سائنسی طریق مطالعہ کے عین مطابق ہے۔

اسلام میں جس چیز کو عقیدہ کہا جاتا ہے اسی کا نام سائنس میں مفروضہ (hypothesis) ہے۔ سائنس داں فطرت کے اٹل نظام کی بنیاد پر ایک بات کو بطور نظری اساس (مفروضہ) مان کر شواہد خارجی کا مطالعہ اور تجزیہ کرتا ہے۔ اور اس طرح ایک ایسی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے جو اس کے عقیدہ یا مفروضہ کے مطابق پیشگی طور پر کائنات میں موجود ہے۔ ٹھیک یہی طریقہ اسلام کا ہے۔

اسلام کا ایک طالب علم وحی کو بطور نظری اساس تسلیم کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ شواہد خارجی کا مطالعہ شروع کرتا ہے۔ یہ بے لاگ مطالعہ آخر کار اس حقیقت کی تصدیق کر دیتا ہے کہ جس چیز کو اس نے بطور نظری اساس مانا تھا وہ عین صداقت تھی۔ یہ مطالعہ کا عین وہی اصول ہے جس کو موجودہ زمانہ میں سائنٹفک طریق مطالعہ کہا جاتا ہے۔

یہاں ایک نوجوان اسکالر، مسٹر گر بخش سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک قیمتی اسکالرشپ پر ٹوکیو میں ریسرچ کے لیے گئے۔ ان کا موضوع خاموشی (silence) کی سائنسی اور مذہبی اہمیت ہے۔ وہ ٹوکیو میں کومازاوا یونی ورسٹی انٹرنیشنل سنٹر کے تحت یہ کام کر رہے ہیں۔

میں نے ان کو ایک حدیث سنائی جس کو سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور اسی وقت

اپنے نوٹ بک میں درج کیا۔ وہ حدیث یہ ہے: مَن صَمَتَ نجا (جو چپ رہا اس نے نجات پائی)
میں نے کہا کہ خاموشی کوئی سلبی فعل نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایجابی فعل ہے۔ آدمی جب
خاموش ہوتا ہے تو وہ دراصل اندرونی فکر میں مشغول ہو جاتا ہے۔ خارجی فکر آدمی کو بہت کچھ
دیتی ہے مگر اندرونی فکر سے آدمی جو کچھ پاتا ہے وہ اپنی گہرائی کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ ہے۔
بنارس کے ڈاکٹر رام جی سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ وہ وہاں گاندھین انسٹی ٹیوٹ آف
اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ہیں۔ (Tel. 330125, 330871)

انھوں نے کہا کہ میں آپ کے مضامین اخباروں میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ دیش میں
سدھار لانے کے لیے آپ ہی جیسے سوچ والے انسان کی ضرورت ہے۔ یہ بات اکثر ہندوؤں نے
مختلف الفاظ میں کہی۔

مسلم رہنما پچھلے پچاس سال سے ہندی اور انگریزی میں اپنا اخبار نکالنے کی بات کرتے رہے
ہیں مگر موجودہ حالات میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ خود ان کے اخباروں میں مضامین شائع کیے
جائیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ملکی اخبارات ہمارے مضامین نہایت شوق سے چھاپنے کے لیے تیار
رہتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ وکیلانہ انداز میں نہ لکھے گئے ہوں بلکہ سنجیدہ اور سائنٹفک انداز
میں لکھے گئے ہوں۔

مہاراشٹر کے گورنر ڈاکٹر الگزینڈر ہندو فلاسفی کے اسکالر رہے ہیں۔ انھوں نے ایک معلوماتی
تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوازم فل اسٹاپ میں یقین نہیں رکھتا حتی کہ کاما میں بھی
نہیں۔ یہ سچائی کی تلاش کا ایک ابدی بہاؤ ہے:

> Hinduism does not believe in full stop, not even comma. It believes in perennial flow of search for truth.

بظاہر یہ ایک خوب صورت بات معلوم ہوتی ہے مگر وہ درست نہیں۔ یہ بیان اپنی نوعیت
کے اعتبار سے خود بھی ایک فل اسٹاپ ہے۔ مذہب کے مختلف تصورات میں سے کسی ایک تصور
کو حتمی قرار دینا اس تصور کو مطلق سچائی کا درجہ دینا ہے۔ جب کہ قائل کا دعویٰ یہ ہے کہ مطلق سچائی
ابھی دریافت ہی نہیں ہوئی۔ جو لوگ اس قسم کی بات کریں ان کے لیے علمی طور پر یہ درست نہیں کہ

وہ مذکورہ قسم کا ایجابی بیان دیں۔ اس کے بجائے انھیں اپنے آپ کو متشکک (sceptic) بتانا چاہیے۔ اپنے کو متشکک نہ کہہ کر مذکورہ بالا قسم کا بیان دینا گویا کہ اپنی پہلی بات کو خود اپنی ہی دوسری بات سے رد کر دینا ہے۔

نوبیل فیملی کی ایک ممتاز شخصیت مسٹر کلیس نوبل بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ انھوں نے چیرمین کی حیثیت سے جو اسپیچ دی اس کے آغاز میں یہ مقولہ نقل کیا —— جہاں بصیرت نہ ہو وہاں لوگ ہلاک ہو جاتے ہیں :

Where there is no vision, the people perish.

ان کی تقریر کافی عالمانہ تھی۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ انسان کو فطرت کے قوانین کی پیروی کرنا چاہیے اسی میں اس کی کامیابی کا راز ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ میں انتہائی حد تک زور دے کر کہوں گا کہ انسانی نسل کو قانون فطرت کی خلاف ورزی چھوڑنی پڑے گی ورنہ وہ خود ختم ہو جائے گی :

With all the emphasis I have at my command, I say: The human race must cease breaking the laws of Nature or Nature, will break us.

وہ ایک عالمی تنظیم یونائیٹڈ ارتھ کے فاؤنڈر اور چیرمین ہیں۔

ایم آئی ٹی پونہ کا ایک ممتاز ٹیکنکل ادارہ ہے۔ اس کے فاؤنڈر ڈائرکٹر پروفیسر وی ڈی کراڈ (V.D. Karad). نے اپنی اسپیچ میں مذہب اور فلسفہ کے متعلق بہت سی باتیں کہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے تھامس ہارڈی کا یہ قول دہرایا کہ مذہب کا بنیادی مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان کو جنت میں داخل کرے بلکہ یہ ہے کہ وہ جنت کو انسان کے اندر داخل کر دے :

The main object of religion is not to get a man into heaven; but to get heaven in him.

مگر اصل حقیقت ان دو کے علاوہ ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مذہب انسان کو جنتی اوصاف کے ساتھ دنیا میں رہنا سکھاتا ہے تاکہ وہ آخرت کی جنت میں داخلہ کا استحقاق پا سکے۔

ایک اور بات انھوں نے یہ کہی کہ مذہب اور سائنس کا حقیقی اتحاد ہی انسان کو دنیا میں امن دے سکتا ہے :

We believe that Union of Science and Religion in the true sense of the word, alone will bring peace and harmony to mankind.

چترلیکھا ویکلی جو مراٹھی اور گجراتی دونوں زبانوں میں نکلتا ہے اس کے نمائندہ ششی کانت ساونت نے ۲۷ نومبر کو انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اسلام سرتاپا امن کا مذہب ہے۔ اسلام کی تمام سرگرمیاں پرامن جدوجہد کے اصول پر مبنی ہے اسلام میں جنگ کوئی ایجابی حکم نہیں وہ صرف دفاع کے لیے ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ جنگ سے بچنے کی تمام ممکن کوشش ناکام ہو چکی ہو اور مقابلہ کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار باقی ہی نہ رہے۔

میرا قیام جس ہوٹل میں تھا وہ مسلم آبادی سے الگ تھا۔ تاہم روزانہ کچھ نہ کچھ مسلمان یہاں آتے رہے اور ان سے گفتگوئیں جاری رہیں۔ ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اورنگ زیب کے زمانہ سے لے کر اب تک مسلمانوں کا صاحب علم طبقہ مرہٹوں کو مسلمانوں کا حریف سمجھتا رہا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مسلمانوں اور مرہٹوں کے درمیان معتدل انسانی تعلقات قائم نہ ہو سکے۔ اس کا نقصان سب سے زیادہ خود مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔

میں نے کہا کہ اس سے پہلے مرہٹوں کا جو ٹکراؤ پیش آیا وہ اصلاً مغل حکومت سے تھا نہ کہ مسلمانوں سے۔ یہ ایک تباہ کن نظریہ ہے کہ مسلم وجود کی شناخت سیاسی اقتدار کو بنایا جائے۔ سیاسی اقتدار ایک ایسی چیز ہے جس کے خلاف ہمیشہ رقابتیں جاری رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ خود اصحاب رسولؐ کے زمانہ میں بھی شدید ترین نوعیت کی سیاسی رقابتیں ابھر آئیں۔ اور اس کی بنا پر زبردست قتل وخون ہوا۔

ایسی حالت میں اگر سیاسی اقتدار کو مسلمانوں کے وجود ملّی کی شناخت بنایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان ابدی طور پر وقت کے حکمرانوں سے ٹکراتے رہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں انھیں کبھی وہ سکون حاصل نہ ہو جو ہر قسم کی ترقیاتی کاموں کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے۔

پونہ کے آٹھ روزہ قیام کے دوران مقامی مسلمانوں سے مسلسل ربط قائم رہا۔ انفرادی ملاقاتوں کے علاوہ ہر روز چھوٹے بڑے اجتماعات ہوتے رہے۔ ایک اجتماع ایک ہال میں ہوا۔ کچھ مسجد میں اور کچھ لوگوں کے گھروں پر۔ ان اجتماعات کا مشترک موضوع یہ تھا ——— اسلام اور مسلمان عہد جدید میں۔

ایک اجتماع میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلم تحریکیں حبط اعمال کا شکار ہوگئیں۔ اس کی خاص وجہ ہمارے رہنماؤں کا دہرا معیار ہے۔ مثلاً ہندستان کا ہندو اگر ایک سے زیادہ شادی پر پابندی لگانے کی بات کرے۔ تو تمام بے ریش اور باریش رہنما اس کے خلاف پرشور تحریک چلانے کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ دوسری طرف خود مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہر گھر میں پہلی بیوی نے دوسرے نکاح کو عملاً پوری طرح بند کر رکھا ہے۔ میں نے حاضرین سے کہا کہ آپ میں سے جس کو میرے اس بیان پر شبہ ہو وہ اپنے گھر میں دوسری بیوی لاکر دیکھے۔

تمام حاضرین نے میری بات سے اتفاق کیا۔

میں نے کہا کہ یہ واضح طور پر ڈبل اسٹینڈرڈ کا معاملہ ہے۔ ایک مسئلہ اگر ہندو پیدا کرے تو ہمارے تمام چھوٹے اور بڑے رہنما بھڑک کر اس کے خلاف سرگرم ہوجاتے ہیں۔ مگر ٹھیک وہی مسئلہ مسلمان پیدا کرے تو کوئی بھی اس پر تحریک چلانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

جو کام اس دہرا معیار کے ساتھ کیا جائے اس کو کبھی بھی خدا کی مدد نہیں مل سکتی۔ اور نہ اس سے کسی بابرکت نتیجہ کی امید کی جاسکتی ہے۔

پونہ میں جناب فاروق فیصل صاحب سے ملاقات ہوئی وہ گورنمنٹ سروس میں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ناندیڑ (مہاراشٹر) میں تبلیغی جماعت کا ریاستی جوڑ ۲۲-۲۴ نومبر ۱۹۹۶ کو تھا۔ وہ خود بھی اس میں شریک تھے۔ انھوں نے بتایا کہ شارٹ سپلائی اسکیم کے تحت دوسرے مقامات کی طرح ناندیڑ میں بھی مختلف علاقوں میں باری باری بجلی کی کٹوتی کرتے رہتے ہیں۔ مگر تبلیغی جماعت کے اجتماع میں مسلسل تین دن تک بجلی کی سپلائی جاری رہی۔ انھوں نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود میرے سامنے سینیر پولس انسپکٹر شری دیش مکھ نے بجلی محکمہ (ایم ایس ای بی) کے انجینیر کو بلایا اور اس سے کہا دیکھو، یہاں مسلمانوں کا دھارمک کاریہ ہو رہا ہے۔ ان دنوں میں یہاں بجلی کٹ مت کرنا۔

پچھلے کچھ برسوں کے اندر ہندستان کے مسلمانوں میں تعمیری کام کی ایک نئی لہر آئی ہے۔ اس کی ایک مثال پونہ بھی ہے۔ پونہ کے ایک مسلم تاجر نے بتایا کہ پونہ کے مسلمانوں نے پچھلے دس سال میں کافی ترقی کی ہے۔ تجارت اور صنعت دونوں میدانوں میں وہ مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس کی کئی مثالیں انھوں نے بتائیں۔

اسی طرح تعلیم کے میدان میں بھی پونہ کافی ترقی کر رہا ہے۔ یہاں ایک قدیم وقف تھا جس میں کافی بڑی زمین تھی مگر وہ تقریباً غیر استعمال شدہ پڑی ہوئی تھی۔ آج کل وہ جناب انعام دار صاحب کے زیر انتظام ہے اور انھوں نے اس کے اندر ایک پوری تعلیمی دنیا آباد کر دی ہے۔ وہ طلبہ کے داخلہ میں یا اساتذہ کے انتخاب میں صرف میرٹ کو سامنے رکھتے ہیں۔ اس بنا پر ان کے تعلیمی اداروں کا معیار کافی اچھا ہے۔

پونہ کی کانفرنس میں میری جو تقریر تھی اس میں میں نے امن سے متعلق قرآن کی آیتیں اور حدیثیں پیش کیں۔ اس پر ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے اسلام کے ایک جزئی پہلو کو پیش کیا۔ آپ نے اسلام کو اس کی جامعیت (Totality) کے ساتھ پیش نہیں کیا۔ یہ تو ناقص نمایندگی تھی، اور دین کی ناقص نمایندگی ایک جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کہا کہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اگر آپ کو اسلام کے تعارف کے طور پر ایک جامع کتاب لکھنا ہو تو اس میں آپ مختلف ابواب مقرر کرکے اسلام کی تمام تعلیمات بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر دعوت کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ دعوت میں ہمیشہ مخاطب کی رعایت کی جاتی ہے۔ مذکورہ قسم کی کتاب میں اگر اسلام کی فہرست احکام کو ملحوظ رکھا جائے گا تو دعوتی خطاب میں ہمیشہ سامعین کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں زیادہ تر دوسری نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لیے ان میں عام طور پر وہی اسلوب کلام ملتا ہے جس کو آپ نے جزئی تعارف یا ناقص تعارف کا نام دیا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں (المسلم من سلم الناس من لسانه ویده) اس طرح کی ہزاروں حدیثیں ہیں جن میں آپؐ نے اسلام کو جامع نظام کے طور پر پیش نہیں فرمایا بلکہ اسلام کے صرف کسی ایک پہلو کو پیش فرمایا۔ اسی کا نام مخاطب کی رعایت ہے۔ اور مخاطب کی رعایت اسلامی دعوت کا ایک اہم اصول ہے۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں اپنے مزاج کے اعتبار سے اَن فٹ ہو کر رہ گئے ہیں۔ آغاز اسلام کے بعد ہزار سال تک مسلم دنیا میں بادشاہی کا دور رہا۔ اس زمانہ میں سارا لٹریچر حاکمانہ فضا میں بنا۔ موجودہ زمانہ میں جب مسلمانوں کا زوال ہوا تو ہمارے تمام رہنماؤں نے مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کا ایک ہی نسخہ دریافت کیا۔ وہ تھا ماضی کی عظمت کو بیان

کرکے انھیں اکسانا۔ اس طرح ماضی کا حاکمانہ مزاج حال میں بھی بدستور باقی رہا۔

مگر موجودہ زمانہ جمہوریت کا زمانہ تھا۔ بادشاہی دور میں غیر مشترک اقتدار کا ماحول ہوتا تھا۔ جمہوریت کے دور میں اشتراک اقتدار (Power sharing) کا ماحول ہے۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے عوام و خواص دونوں ہی اقتدار میں شرکت کے تصور سے ناآشنا ہیں۔ وہ جمہوریت کے دور میں حاکمانہ نفسیات کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔ اس سبب سے وہ دور حاضر میں بالکل اَن فٹ ہوکر رہ گئے ہیں۔

قدیم حاکمانہ دور صرف اپنی رعایت کرنا جانتا تھا۔ جدید جمہوری دور دوسروں کی رعایت کا متقاضی ہے۔ قدیم دور میں بلاشرکت صرف اپنا اقتدار تھا۔ اب نئے زمانہ میں دوسروں کی شرکت کے ساتھ روادارانہ نظام پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ مگر مسلمانوں کے مقررین اور محررین نے ان کے اندر نئے حالات کے مطابق ذہن نہیں بنایا۔ اس کے بھیانک نتائج ہر مسلم ملک اور ہر مسلم معاشرہ میں پیش آرہے ہیں۔

ایک خطاب میں میں نے کہا کہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ امت محمدیؐ کا ثواب زیادہ ہے۔ یہ سادہ طور پر کوئی فضیلت کا معاملہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ امت محمدیؐ کی ذمہ داری زیادہ ہے اس لیے اس کا انعام بھی زیادہ ہے۔ پچھلی امتوں کی نجات کے لیے یہ کافی تھا کہ وہ عبادت اور اخلاق کے معیار پر پورے اتریں۔ مگر امت محمدی کی ایک اور لازمی ذمہ داری ہے اور وہ غیر اقوام میں حق کا پیغام پہنچانا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی مگر کار نبوت بدستور باقی ہیں۔ یہ کار نبوت دعوت الی اللہ ہے۔ پچھلے زمانوں میں پیغمبر براہ راست طور پر دعوت کا کام کرتے تھے۔ اب ختم نبوت کے بعد امت محمدی کو آپؐ کی نیابت میں یہ کام انجام دینا ہے۔ اس طرح چونکہ ان کی ذمہ داری زیادہ ہے اس لیے ان کا ثواب بھی زیادہ ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پچھلی امتوں کی نجات اگر ایک عمل پر موقوف تھی تو اب امتِ محمدی کی نجات کا انحصار دو عمل پر موقوف ہوگئی ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ یہ تو بہت مشکل معاملہ ہے۔ ہر مسلمان دعوت کا کام کس طرح کرسکتا ہے۔ میں نے کہا کہ عام شرعی اصول کے مطابق یہ ذمہ داری بھی حسب استطاعت ہے۔ اصل

یہ ہے کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے تین مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ نیت کا ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو مخالفِ دعوت اعمال سے روکنا ہے اور تیسرا مرحلہ براہ راست دعوت دینے کا ہے۔ جس مسلمان یا جس مسلم گروہ کی جو استطاعت ہوگی اسی کے مطابق اس سے خدا کا مطالبہ ہوگا۔

نیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے دل میں دعوت کی سچی تڑپ پیدا ہو جائے اور اس کا معیار یہ ہے کہ آپ اپنی تنہائیوں میں مدعو کی ہدایت کے لیے دعا کرنے لگیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہر اس کارروائی سے اپنے کو بچایا جائے جو داعی اور مدعو کے درمیان نفرت اور کشیدگی پیدا کرنے والی ہو۔ اس معاملہ میں مسلمان کا حال یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے لیے یک طرفہ نقصان کو برداشت کر لیں مگر وہ کوئی ایسی تحریک نہ اٹھائیں جو داعی اور مدعو کے تعلقات کو غیر معتدل بنانے والی ہو۔ تیسری چیز براہ راست دعوت ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اس کام کو دعوت اسلام کے نام پر کرنے کے بجائے تعارف اسلام کے نام پر کیا جائے۔ عنوان کا یہ فرق ایک نیا دعوتی امکان ہے جو جدید تبدیلیوں کے نتیجہ میں ہمارے لیے پیدا ہوا ہے۔

کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے ان کے موقف میں ایک عجیب تضاد محسوس کیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگوں کا عجیب حال ہے۔ اگر میں عقلی دلیل سے کوئی بات کہوں تو آپ کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث کی دلیل لاؤ۔ اور جب میں قرآن و حدیث کی دلیل پیش کرتا ہوں تو آپ اس کے خلاف اپنی عقلی قیاسات پیش کرنے لگتے ہیں۔

یہ حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنے مانوس افکار میں جیتے ہوں اور سچائی کو جاننے کے لیے سنجیدہ نہ ہوں۔ انھیں وہی بات اپیل کرتی ہے جو ان کے اپنے ذہن کی تصدیق کر رہی ہو۔ جو چیز ان کے مانوس ذہن سے ٹکرائے وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ خواہ کتنی ہی زیادہ دلیل ان کے سامنے پیش کر دی جائے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کی غلط فکری ہے۔ اور غلط فکری کی وجہ یہ ہے کہ وہ صحیح معیار اور غلط معیار کے فرق کو نہیں جانتے۔ مثلاً کسی سے غیر مسلموں میں دعوت کی بات کیجئے تو وہ فوراً کہے گا کہ ابھی تو مسلمانوں ہی کی اصلاح نہیں ہوئی تو غیر مسلموں میں دعوت کا کام کیسے کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ دعوت کا یہ معیار

ہی نہیں کہ مسلمان سب کے سب اصلاح یافتہ ہوجائیں تب وہ دعوتِ عام کا کام کریں۔ دعوت بذاتِ خود مطلوب ہے جس طرح نماز خود مطلوب ہے۔ مسلمانوں کے اصلاح یافتہ ہونے یا نہ ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی کسی روش پر انھیں نصیحت کیجئے تو فوراً اپنے "اکابر" کا قول اپنی تائید میں پیش کر دیں گے۔ حالاں کہ دین میں اکابر کا قول معیار نہیں ہے بلکہ قرآن و حدیث کو واحد معیار کا درجہ حاصل ہے۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے یہ جاننا ہوگا کہ استدلال کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس کے بعد ہی ان کے اندر صحیح سوچ اور صحیح فیصلہ کی صفت پیدا کی جاسکتی ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلموں میں بہت بڑی بڑی جماعتیں اور تحریکیں موجود ہیں۔ مسلمانوں کی بیشتر تعداد کسی نہ کسی طور پر ان سے جڑی ہوئی ہے۔ مگر دین کی اصل روح (تقویٰ) کہیں نظر نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ یہ تحریکیں تقویٰ کے اصول پر اٹھائی ہی نہیں گئیں۔ پھر ان سے تقویٰ کا نتیجہ کیوں کر برآمد ہوسکتا ہے۔

آپ غور کیجئے تو تمام تحریکیں اور جماعتیں دین کے مظاہر پر اٹھائی گئیں نہ کہ دین کی روح (اسپرٹ) پر۔ کسی نے مظاہر عبادت کو، کسی نے مظاہر شرک کو، کسی نے مظاہر سیاست کو، کسی نے کسی اور مظاہر کو۔ چنانچہ ہر جماعت اور ہر تحریک میں مظاہر کی دھوم دکھائی دے رہی ہے۔ دین کی روح یا دین کی اسپرٹ کسی کا نشانہ نہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں نہ روح دین پر زور ہے اور نہ ان سے وابستہ لوگوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ روح پر زور دیا جائے تو روح اور مظاہر دونوں پیدا ہوں گے۔ اور اگر صرف مظاہر پر زور دیا جائے تو مظاہر تو پیدا ہوجائیں گے مگر اصل روح کا کہیں وجود نہیں ہوگا۔

ایک صاحب نے کہا کہ الرسالہ کی مخالفت اب کافی کم ہوگئی ہے۔ میں نے کہا کہ یوں نہ کہئے۔ بلکہ یہ کہئے کہ بعض غلط فہمیاں دور ہوگئیں اس لیے مخالفت بھی ختم ہوگئی۔ مثلاً ہندوؤں کے اجتماعات میں میری شرکت کو کچھ لوگوں نے اس معنی میں لے لیا تھا کہ میں ہندو نوازی کر رہا ہوں۔ مگر اس کی جو رپورٹیں چھپیں ان کو دیکھ کر لوگوں نے جانا کہ میں وہاں اس لیے جاتا ہوں کہ اسلام کا مثبت تعارف پیش کروں اور اس کے خلاف ان کی غلط فہمیوں کو دور کروں۔ یہ جاننے کے بعد لوگ اپنے آپ مطمئن ہوگئے۔

الرسالہ کے ایک قاری نے سوال کیا کہ آپ باتوں کو پیشگی طور پر کیسے جان لیتے ہیں۔ آپ نے لکھا تھا کہ افغان، روس لڑائی جب ختم ہو گی تو افغانی لوگ آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے، اور واقعتہً ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح آپ نے لکھا تھا کہ بابری مسجد کا ڈھایا جانا فل اسٹاپ ہے وہ کاما نہیں ہے اور اس معاملہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا ہی پیش آیا ہے۔

اسی طرح جب تمام لوگ فرقہ وارانہ فساد کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ وہ صرف حکومت کے روکنے سے رکے گا اس وقت آپ نے یہ کہا کہ مسلمان اگر صبر و تحمل کی پالیسی اختیار کر لیں تو فرقہ وارانہ فساد کا بم اپنے آپ ناکارہ ہو کر رہ جائے گا، اور اس معاملہ میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسا ہی پیش آیا۔ اب ایک عرصہ سے مسلمان اس معاملے میں صبر و تحمل سے کام لے رہے ہیں چنانچہ فرقہ وارانہ فساد بھی عملاً تقریباً ختم ہو گیا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ کوئی پراسرار بات نہیں ہے۔ آپ بھی اسی طرح باتوں کو پیشگی طور پر جان سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ اپنے اندر غیر متعصبانہ اور غیر جانبدارانہ طرز فکر پیدا کر لیں۔ بابری مسجد کے معاملہ کو دوسرے لوگ اس لیے نہیں سمجھ پائے کہ وہ ہندو نفرت میں مبتلا تھے۔ یہ نفرت اصل بات کو سمجھنے میں رکاوٹ بن گئی۔ میں خدا کے فضل سے ہندو نفرت سے خالی تھا۔ اس لیے میں اس کی حقیقت سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی طرح افغانستان کے معاملہ کو سمجھنے سے دوسرے لوگ اس لیے قاصر رہے کہ وہ افغانی لڑائی کو جہاد فی سبیل اللہ سمجھ بیٹھے تھے۔ میں اس قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ ساری جنگ قبائلی جذبہ کے تحت ہو رہی ہے نہ کہ خدائی جذبہ کے تحت۔ اسی لیے مجھے اس کی اصل حقیقت کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ یہی معاملہ فرقہ وارانہ فساد کا بھی ہے لوگ اس کو ظلم اور تعصب اور سازش کی اصطلاحوں میں دیکھ رہے تھے اس لیے وہ معاملہ کو زیادہ گہرائی سے سمجھ نہ سکے۔ میں نے خالی الذہن ہو کر اس کو فطرت کے قانون کی روشنی میں دیکھا اس لیے میں اس کی تہہ تک پہنچ گیا۔

ایک مجلس میں گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ کسی شخص کے اندر اعلیٰ انسانیت موجود ہے یا نہیں، اس کا ایک معیار مقرر کرنا ہو تو وہ اعتراف ہو گا۔ اور اگر دو معیار مقرر کرنا ہو تو اعتراف اور احسان مندی۔ اس میں شک نہیں کہ دلیل سامنے آنے کے بعد فوراً اس کے وزن کو محسوس کرنا اور اپنی غلطی کا اعتراف

کرلینا اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ اسی طرح کسی شخص سے دوسرے آدمی کو فائدہ پہنچے تو اس فائدہ پہنچانے والے شخص کا احسان مند ہونا اعلیٰ ترین انسانی خصوصیت ہے۔

پونہ میں کچھ لوگوں سے دعوت کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ اکثر لکھتے ہیں کہ مسلمان دعوت کا کام نہیں کر رہے ہیں حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ آج دعوت کا کام ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا یہ قول، قرآن کے الفاظ میں یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳ : ۱۸۸) کا مصداق ہے۔ یعنی ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا جس کو آدمی نے کیا نہ ہو۔

میں نے کہا کہ دعوت کا سرچشمہ محبت انسانی ہے، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں محبت انسانی کا بظاہر وجود ہی نہیں۔ اور جب انسان سے محبت ہی نہ ہو تو اس کو آپ دعوت حق کا مخاطب کس طرح بنا سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پریس کا دور آنے کے بعد ۱۹ ویں اور ۲۰ ویں صدی کے درمیان مسلم اہل قلم نے کروروں کی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں مگر آپ اردو، انگریزی، عربی اور فارسی میں کسی ایک کتاب کی بھی نشان دہی نہیں کر سکتے جو حقیقی معنوں میں محبت انسانی کے موضوع پر لکھی گئی ہو۔ اسی طرح اس دور میں بے شمار تعداد میں جلسے کیے جا رہے ہیں مگر میرے علم کے مطابق کوئی ایک بھی مسلم جلسہ نہیں جس کے پیچھے حقیقۃً محبت انسانی کا جذبہ کام کر رہا ہوں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا واحد اثاثہ ان کا قومی فخر ہے۔ ان کے درمیان وہی تحریکیں اور جماعتیں فروغ پاتی ہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ان کی نخوت قومی کی تصدیق کر رہی ہوں۔ اور جو تحریک یا جماعت ان کی قومی نخوت کو اپیل نہ کرے وہ ان کے درمیان فروغ بھی نہیں پاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان سے محبت کرنا خود ایک عبادت ہے۔ وہ اسلامی اخلاق کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ مگر موجودہ مسلمانوں میں اسلام کا یہ پہلو کامل طور پر اجنبی ہے۔ اسی کا ایک ظاہرہ ساری دنیا میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کوئی ایسی بات کہہ دے جو مسلمانوں کے قومی وقار سے ٹکراتی ہو تو وہ فوراً بپھر کر اس کے خلاف متشددانہ تحریک شروع کر دیتے ہیں۔ آج سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ مزاج ختم کیا جائے۔ غیر مسلموں کے تئیں یہ مزاج رکھتے ہوئے وہ دعوتی کام کے اہل ہی نہیں۔ انھیں غیر مسلموں کے حق میں یک طرفہ طور پر خیر خواہ اور متحمل بننا پڑے گا۔ ورنہ وہ خدا کے یہاں اس بات کے مجرم قرار پائیں گے کہ انھوں نے خدا کی مخلوق کو خدا کا پیغام پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔

ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ فقہ کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ جس چیز کے بغیر کسی واجب کو پورا نہ کیا جا سکتا ہو وہ بھی واجب ہو جاتا ہے (ما لا یتم الواجب الا بہ فہو واجب) مثلاً سمت کا علم اگر نہ ہو تو بیرونی علاقہ کے لوگوں کے لیے قبلہ کے رخ کا تعین کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس لیے جس طرح نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے اسی طرح سمت کے علم کا حصول بھی ضروری ہے تاکہ قبلہ کے رخ کا تعین ہو سکے۔

یہی معاملہ دعوت کا ہے۔ دعوت کا کام صحیح طور پر صرف اس وقت انجام دیا جا سکتا ہے جبکہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات ہوں۔ اس لیے داعی گروہ پر جس طرح دعوت دینا لازم ہے اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے اور مدعو کے درمیان تعلق کو بگڑنے نہ دے۔ وہ یک طرفہ کوشش کے ذریعہ دونوں کے درمیان تعلق کو برقرار رکھے۔ کیوں کہ اس کے بغیر دعوت کے عمل کی بجاآوری ممکن ہی نہیں۔

پونہ کے ایک صاحب نے ایک پاکستانی عالم کی ایک کتاب دکھائی وہ شرک کے بارے میں تھی۔ اس میں شرک کی چند قسمیں بتائی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک سیاسی شرک بھی تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نے کہا کہ "سیاسی شرک" کا تصور اسلام میں ایک اضافہ ہے جو میرے نزدیک ناقابل معافی جسارت ہے۔ اس قسم کی بات حضرت علیؓ کے زمانہ میں خوارج نے کی تھی۔ اس کے بعد پوری اسلامی تاریخ میں کبھی بھی ایسی بات نہیں کہی گئی۔ موجودہ زمانہ میں کچھ نام نہاد مفکرین نے خوارج کے نظریہ کو از سرِ نو سیاسی شرک کے نام سے زندہ کیا ہے۔

میں نے کہا کہ شرک سیاسی کا نظریہ اتنا ہی بے اصل ہے جتنا کہ نبوتِ ظلی کا نظریہ۔ دونوں یکساں طور پر قابل رد ہیں۔ اس قسم کے نظریہ کی تبلیغ ایک فتنہ ہے نہ کہ اسلام کی کوئی خدمت۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی نظریہ نے ساری دنیا میں مسلمانوں کو حکمراں طبقہ سے ٹکرا رکھا ہے جس کے نتیجہ میں اسلام کے خلاف اتنی زیادہ نفرت پیدا ہوگئی ہے کہ دعوت توحید کا کام کرنا ہی سخت مشکل ہوگیا ہے۔

الرسالہ میں ایک مسلم شخصیت کی ایک بات پر تنقید چھپی تھی۔ اس پر ایک صاحب نے شکایت کی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے جوش میں آکر کہا: وہ اتنے بڑے تھے کہ ان سے کوئی چھوٹا بھی نہیں۔

میں نے کہا کہ یہ تو صرف آپ کے کچھ الفاظ ہیں۔ یہ کوئی دلیل نہیں۔ اگر صرف لفظ ہی بولنا ہو تو دوسرا شخص کہہ سکتا ہے کہ : وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ ہر شخص ان سے بڑا ہے۔

آج کل اس طرح کا استدلال عام ہے۔ لوگ ادبی انداز میں کچھ الفاظ بول دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے دلیل دی۔ حالاں کہ الفاظ خواہ وہ نحو اور صرف کے لحاظ سے کتنا ہی درست ہوں، حقیقت کے اعتبار سے وہ بالکل بے معنی ہو سکتے ہیں۔ اوپر کے دونوں جملے اسی کی ایک مثال ہیں۔ استدلال نام ہے حقائق کی بنیاد پر علمی اور منطقی تجزیہ کرنے کا، نہ کہ محض کچھ الفاظ بول دینے کا۔

حیدر آباد کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے بارے میں حیدر آباد کے اردو اخبار میں یہ چھپا ہے کہ آپ نے حال میں حیدر آباد کا خفیہ دورہ کیا۔ اس کے پیچھے کوئی یہودی سازش کار فرما نظر آتی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک لغوبات ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی خفیہ دورہ نہیں کیا۔ نہ حیدر آباد کا نہ کسی اور جگہ کا۔

پھر میں نے پوچھا کہ آپ کس طرح کہتے ہیں کہ وہ "خفیہ دورہ" تھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے حیدر آباد کے دورہ کی خبر وہاں کے اخباروں میں نہیں چھپی۔ میں نے کہا کہ آپ یہاں اپنے بیان کے مطابق ایک دورہ پر آئے ہیں مگر آپ کے آنے کی کوئی اطلاع یہاں کے اخبارات میں نظر نہیں آئی۔ پھر کیا آپ کا یہ دورہ کوئی خفیہ دورہ ہے۔ وہ خاموش ہو گئے۔

رات کو فجر سے پہلے چار بجے سو کر اٹھا۔ وضو کر کے دو رکعت نماز لمبی قرأت کے ساتھ پڑھی۔ اس کے بعد اپنے کمرہ میں بیٹھا تو اچانک یاد آیا کہ شری گرو گولوالکر اور مسٹر ارن شوری نے لکھا ہے کہ ایک گڈ مسلم کبھی گڈ انڈین نہیں بن سکتا۔ یہ سوچتے ہوئے بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے کہ یہ لوگ انسان کو کتنا کم جانتے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ انسان سے واقف انیسویں صدی کا امریکی شاعر والٹ وہٹ مین (Walt Whitman) تھا جس نے کہا کہ :

I am large enough to contain all these contradictions.

میں یہ کہہ رہا تھا اور رو رہا تھا کہ بخدا میں ایک گڈ مسلم ہوں اور اسی کے ساتھ میں گڈ انڈین بھی ہوں۔ یہ میری شرافت انسانی کی توہین ہے کہ یہ کہا جائے کہ میں جس ملک میں پیدا ہوا، اس کا میں اچھا شہری نہیں ہوں۔ وطن کی محبت ایک خالص فطری جذبہ ہے۔ اور جس چیز کی جڑیں خود فطرت انسانی میں ہوں اس

سے کوئی انسان کبھی خالی نہیں ہوسکتا۔

میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر مہاتما گاندھی پیدا ہوں اور کہیں کہ میں تم کو گڈ انڈین ہونے کا سرٹیفکٹ دیتا ہوں تو میں ایسا سرٹیفکٹ لینے سے انکار کر دوں گا۔ میں کہوں گا کہ کیا کسی بیٹے کو اس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ماں کا اچھا بیٹا بننے کے لیے کسی اور کا سرٹیفکٹ حاصل کرے۔ بخدا میں کسی گرو گولوالکر یا کسی گاندھی کے سرٹیفکٹ کے بغیر ہی ایک گڈ انڈین ہوں۔ انڈیا کی محبت میں نکلنے والے میری تنہائیوں کے آنسو جن کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا وہ بذات خود اس کے لیے کافی ہیں کہ میں اپنے آپ کو پورے معنی میں ایک گڈ انڈین سمجھوں۔

ایک بار میں مسلمانوں کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص نے حدیثِ رسولؐ کے طور پر یہ جملہ سنایا: "حب الوطن من الایمان" اس مجلس میں ایک عالم بھی تھے انھوں نے کہا کہ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ وہ ایک عربی مقولہ ہے۔ ایک اور شخص نے کہا کہ وطن کی محبت کے بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی واضح حوالہ موجود نہیں۔

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ "حب الوطن من الایمان" کوئی حدیث رسولؐ نہیں۔ مگر اس کو عربی مقولہ کہنا بھی درست نہیں ہے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ فطرت کا مقولہ ہے یہ انسانی فطرت کی آواز ہے جو ہر زبان میں مختلف الفاظ میں پائی جاتی ہے اور جو چیز عین فطرت کا حصہ ہو اس کا ذکر قرآن وحدیث میں ہونا ضروری نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ کیا قرآن میں کہیں لکھا ہوا ہے کہ اے ماں، تو اپنے بیٹے سے محبت کر۔ اے انسان، تو ہوا میں سانس لے۔ اے پیاسا، تو ٹھنڈا پانی پیا کر۔ یہ باتیں قرآن وحدیث میں درج نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب فطرت کے لازمی تقاضے ہیں اور جو چیز فطرت کا لازمی تقاضا ہو وہ اپنے آپ آدمی کی زندگی میں شامل رہتی ہے اس کے لیے کسی خارجی حکم کی ضرورت نہیں۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں میں دعوت کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح کی جائے۔ یہ بالکل بے اصل بات ہے۔ اس کا تعلق نہ شریعت سے ہے اور نہ عقل سے۔ اس کے بجائے غیر مسلموں میں دعوت کے کام کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کشیدگی کی فضا کو ختم کیا جائے۔ غیر مسلموں میں

دعوت کے نفوذ کی راہ میں اصل رکاوٹ یہی کشیدگی ہے نہ کہ مسلمانوں کی عملی کوتاہی۔ اگر مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہوجائیں تو فوراً ہی دعوت کا عمل شروع ہوجائے گا۔ اس کے بعد دونوں کا باہمی اختلاط ہی دعوت کے لیے کافی ہوجائے گا جس طرح وہ پچھلے زمانوں میں ہوا تھا۔

ایک مسلمان نے کہا کہ کانفرنس میں آپ کی دونوں تقریریں امن واخوت کے موضوع پر تھیں۔ آپ نے براہ راست اسلامی دعوت پیش نہیں کی۔ میں نے کہا کہ کانفر ،والوں کی طرف سے جو موضوع دیا گیا تھا، مجھ کو بہر حال اسی موضوع پر بولنا تھا۔ اگر میں خود ساختہ طور پر کسی اور موضوع پر بولنے لگتا تو وہ غیر متعلق (irrelevant) ہوجاتا۔ اور پھر اہل علم کی اس کانفرنس میں میری تقریر کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔

دوسری بات یہ کہ جس طرح براہ راست دعوت ایک کام ہے اسی طرح تقریب دعوت بھی ایک ضروری کام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریب دعوت براہ راست دعوت کا پہلا مرحلہ ہے۔ اس حکمت کے بغیر دعوت کا کام موثر طور پر انجام نہیں دیا جاسکتا۔ یہی پیغمبرانہ سنت ہے اور فطرت کا تقاضا بھی۔

پونہ ہندستان کے ان چند مقامات میں سے ہے جس کی معتدل آب وہوا کی بنا پر انگریزوں نے اس کو اپنی رہائش کے لیے پسند کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پونہ میں برٹش حکومت کے ابتدائی زمانہ ہی میں تعلیم کا رواج ہوگیا چنانچہ آج یہاں بہترین تعلیمی ادارے قائم ہیں اور عمومی طور پر لوگ تعلیم یافتہ نظر آتے ہیں۔ اسی کا یہ فائدہ ہے کہ پونہ کے لوگوں میں جو شعور اور ڈسپلن نظر آتا ہے وہ ملک کے دوسرے حصوں میں کم ملے گا۔ مثلاً یہاں کی سڑکوں پر یہ ایک عام منظر ہے کہ سواریاں اپنی اپنی لین میں چلتی ہیں۔ وہاں دہلی والی صورت نہیں ہے جہاں سڑکوں پر ہر آدمی ضابطہ کو توڑ کر اپنی گاڑی بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔ پونہ کی سڑک پر آپ اپنی گاڑی چلا رہے ہوں اور اُوورٹیک کرنے کے لیے اپنا ہارن بجائیں تو اگلا آدمی فوراً ہی اپنی گاڑی کو کنارے کرلے گا۔ دلّی جیسے شہروں میں ایسا نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ فوراً ہی اس کو وقار کا مسئلہ بنالیتے ہیں جب کہ پونہ میں بار بار مجھے اس کا تجربہ ہوا کہ اس طرح کے مواقع پر کوئی آدمی اس کو وقار کا مسئلہ نہیں بناتا بلکہ سادہ طور پر صرف یہ دیکھتا ہے کہ میں ہلکی رفتار سے چل رہا ہوں اور پیچھے والا تیز رفتار سے تو مجھے کنارے ہٹ جانا چاہیے تاکہ پیچھے والا رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھ جائے۔

پونہ مرہٹوں کا تاریخی علاقہ ہے۔ یہ علاقہ نہ صرف نام کے اعتبار سے مہاراشٹر ہے بلکہ یہ علاقہ ہندستان

کے سب سے زیادہ اہم علاقہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ بمبئی بھی اسی علاقہ کا ایک حصہ ہے جو ہندستان کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ دولت مند شہر سمجھا جاتا ہے ۔

اورنگ زیب سے لے کر بعد کے تمام مسلم رہنما بشمول شاہ ولی اللہ دہلوی سب سے بڑا مسئلہ مرہٹوں کو سمجھتے رہے ۔ ان کا خیال تھا کہ مرہٹوں کے زور کو توڑنا مسلم عہد کو دوبارہ واپس لانے کے ہم معنی ہے ۔ یہ تصور بیک وقت دو اعتبار سے سطحی تھا ۔ ایک یہ کہ حال کے اعتبار سے یہ دراصل انگریز تھے جو ہندستان میں مسئلہ بن رہے تھے ۔ اور مستقبل کے اعتبار سے مراٹھا قوم مزید زور آور ہو کر دوبارہ اس علاقہ کی طاقت نمبر ایک بننے والی تھی ——— سطحی مشاہدہ اور گہری بصیرت میں کتنا زیادہ فرق ہے ، اس کی ایک مثال اس واقعہ میں دیکھی جاسکتی ہے ۔

ہمارے ہوٹل کے عین سامنے فرگوسن کالج ہے ۔ یہ کالج سوا سو سال پہلے انگریزوں نے قائم کیا تھا ۔ یہ تاریخی کالج بہت بڑے کیمپس میں واقع ہے ۔ پونہ میں تعلیم کے عمومی رواج میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے ۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد اس وقت کے برٹش حکمرانوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ ہندستانیوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم پڑھائے جائیں ۔ اس سے وہ یہ امید رکھتے تھے کہ ہندستانیوں کے باغیانہ جذبات ختم ہو جائیں گے اور وہ اس ملک میں آسانی کے ساتھ حکومت کر سکیں گے ۔ اس فیصلہ کے تحت انھوں نے ملک کے مختلف مقامات پر انگریزی زبان اور مغربی تعلیم کے ادارے قائم کیے یا قائم کرنے میں مدد کی ۔ انھیں میں سے ایک علی گڑھ کا تعلیمی ادارہ ہے جو اب مسلم یونی ورسٹی کے نام سے جانا جاتا ہے ۔ آج اس ادارہ کو "عظمت ملی" کا نشان بتایا جاتا ہے ۔ انگریزی دور میں جب سرسید اور ان کے ساتھیوں نے یہ تعلیمی ادارہ قائم کیا تو مسلمانوں کی طرف سے اس کی زبردست مخالفت کی گئی ۔ یہ دراصل انگریز تھے جن کی براہ راست یا بالواسطہ مدد سے اس ادارہ کو قائم کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ۔

پونہ کی سڑکوں سے بار بار گزرنا پڑا ۔ اس دوران مختلف ایسے مناظر دیکھے جو کافی سبق آموز تھے ۔

مثلاً ایک بار سڑک سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اسکول کے طلبہ جو سب کے سب یونیفارم میں تھے دو ، دو کی قطار بنائے ہوئے لمبی لائن میں فٹ پاتھ سے گزر رہے ہیں ۔ یہ ڈسپلن شمالی ہند کے شہروں میں کم نظر آتا ہے ۔ اسی طرح اتوار کے دن یہی منظر دوبارہ نظر آیا ۔ فٹ پاتھ پر بڑی

تعداد میں لوگ لمبی لائن میں خاموشی کے ساتھ چلے جارہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ چرچ جارہے ہیں۔

اس واقعہ میں دو سبق ہے۔ ایک یہ کہ پوری سڑک پر بکھر کر چلنے کی صورت میں یہ لوگ دوسرے مسافروں کے لیے مسئلہ بن جاتے۔ انھوں نے اس کا آسان حل یہ دریافت کیا کہ فٹ پاتھ پر اپنی لمبی لائن بنالیں۔ دوسرا سبق یہ تھا کہ جب دائیں بائیں پھیلنے کے مواقع نہ ہوں تو آگے اور پیچھے کی طرف لمبی لائن میں پھیل جاؤ۔ اس دنیا میں ہر مشکل کا سادہ حل موجود ہوتا ہے بشرطیکہ آدمی اپنی عقل کو استعمال کرے۔

اسی طرح دو بار یہ صورت پیش آئی کہ ہماری گاڑی بھیڑ میں کسی سائیکل یا اسکوٹر سے ٹکرا گئی۔ دونوں بار ایسا ہوا کہ سائیکل اور اسکوٹر والے نے پیچھے مڑ کر ایک بار دیکھا اور پھر خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ حالاں کہ اس قسم کا واقعہ اگر دلی میں ہو جائے تو دونوں میں تکرار ہونا لازمی ہے۔ حتی کہ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں میں ہاتھا پائی کی نوبت آجائے ـــــ ایک ہی ملک کے دو حصوں میں مزاج کا اتنا زیادہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ غالباً پالیٹکس ہے۔ دہلی جیسے علاقوں میں مدت سے پالیٹکس کی دھوم جاری رہی ہے جس نے لوگوں کو بے برداشت اور اشتعال پسند بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس پونہ جیسے علاقوں میں سیاست کا زور کم تھا۔ اس لیے وہاں کے لوگ عام طور پر متحمل اور تعمیر پسند ہیں۔

ڈاکٹر بارنگے (۷۴ سال) پونہ کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ وہ انتہائی حد تک سیکولر اور غیر متعصب آدمی ہیں۔ ایک ملاقات میں انھوں نے کہا کہ پاکستان کی تجویز مسٹر جناح سے پہلے اقبال نے پیش کی تھی۔ اس اعتبار سے پاکستان کے اصل فکری قائد اقبال ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ یہ بات مجھے بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف اقبال نے یہ شعر کہا کہ :

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

مگر انھیں اقبال نے برصغیر ہند میں مذہب کے نام پر پارٹیشن کی تائید کی۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مستقل طور پر مذہبی بیر کا سبب بن گیا۔

میں نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ مذہب محبت سکھاتا ہے وہ بیر نہیں سکھاتا۔ لیکن جب مذہب کو زر اور زمین کے مسئلہ سے جوڑا جائے گا تو ہمیشہ وہی الٹا نتیجہ نکلے گا جو برصغیر ہند میں نکلا۔ صحیح بات یہ ہے کہ مذہب کو صرف دل سے جوڑنا چاہیے۔ مذہب کا اصل کام آدمی کے اندر فکری اور روحانی انقلاب لانا ہے۔ بقیہ خارجی اصلاحات اپنے آپ انسانی انقلاب کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔ خارجی چیزوں کو اگر

براہ راست تحریک کا نشانہ بنایا جائے تو اس سے صرف فساد پیدا ہوگا نہ کہ اصلاح۔

ڈاکٹر سریندر بارلنگے نے یکم دسمبر کی صبح کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا تھا۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ ڈاکٹر بارلنگے کی عمر تقریباً ۷۵ سال ہے اور وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ گفت گو کے دوران میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کے برت کو انگریز وائسرائے نے اپنی فوجوں سے زیادہ طاقت ور بتایا تھا۔ پھر مہاتما گاندھی نے ملک کے بٹوارے کو روکنے کے لیے اپنی یہ طاقت کیوں نہیں استعمال کی۔

ڈاکٹر بارلنگے نے کہا کہ مہاتما گاندھی سے براہ راست یہ سوال کیا گیا تھا انھوں نے جواب دیا کہ میرے برت کی طاقت اس وقت ہے جب کہ عوام میرے ساتھ ہوں۔ اور اب یہ حالت ہو چکی ہے کہ بٹوارے کے سوال پر دیش کے عوام میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ ڈاکٹر بارلنگے نے کہا کہ اس وقت میں ایک مراٹھی اخبار 'انقلاب' نکالتا تھا۔ میں نے خود اپنے اخبار میں اس پر اداریہ لکھا تھا جس میں میں نے کہا تھا کہ ــــــ پاکستان دو، آزادی لو۔ انھوں نے کہا کہ اس سوال پر اگر مہاتما گاندھی برت رکھتے تو یقیناً ان کا برت ناکام ہو جاتا۔ کیوں کہ عوام آزادی کے لیے مزید انتظار پر تیار نہ تھے۔

اس گفت گو کے بعد مجھے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب (آزادیٔ ہند) یاد آئی۔ انھوں نے اس معاملہ پر جو کچھ لکھا ہے اس میں مذکورہ پہلو کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ انھوں نے ملک کی تقسیم کے معاملہ کو صرف چند سیاسی شخصیتوں کا معاملہ بنا دیا ہے وہ اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ جمہوری دور میں کسی سیاسی شخصیت کی طاقت صرف اس وقت ہے جب کہ عوام کی بھیڑ اس کے ساتھ ہو۔ عوامی بھیڑ سے کٹتے ہی سیاسی لیڈر کا حال ایسا ہو جاتا ہے جیسے ترازو کے پلڑے پر گرام کا باٹ چھوڑ کر کوئنٹل کا باٹ اس سے اتار لیا جائے۔

۳۰ نومبر کو کانفرنس ختم ہو گئی مگر اس کے معاً بعد یکم دسمبر ۱۹۹۶ کو ایک خصوصی جلسہ ہوا۔ ایک بڑے پنڈال میں کافی لوگ اکٹھا تھے۔ یہ جلسہ ورلڈ پیس یونی ورسٹی کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں دوسرے ممتاز افراد کے علاوہ ڈاکٹر کلیس نوبیل (فاؤنڈر چیرمین، یونائٹیڈ ارتھ، نیویارک) فرانسین فورنیر (اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل، یونیسکو، فرانس) شامل تھے۔

اس موقع پر دوسروں کے علاوہ میری بھی ایک تقریر ہوئی۔ میں نے کہا کہ امن کے مقصد کے لیے ایک تعلیمی اور تربیتی ادارہ قائم کرنا بہت خوش آیند بات ہے۔ میں دل سے بے حد امن پسند آدمی ہوں۔

چنانچہ امن وانسانیت کی باتیں کرتے ہوئے میرا دل بھر آیا۔ میں بے اختیار رونے لگا۔ میرے درد بھرے انداز کو دیکھ کر مجمع بھی رو پڑا۔ اختتام پر جب میں اسٹیج سے نیچے اترا تو بہت بڑی تعداد میں لوگ برکت لینے کے لیے میرے گرد اکٹھا ہو گئے۔ یہ انگریزی تقریر ان شاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

یکم دسمبر ۱۹۹۶ کی شام کو پونہ سے واپسی ہوئی۔ یہ سفر بذریعہ انڈین ایر لائنز طے ہوا۔ پونہ ایرپورٹ پر اتفاقاً مسٹر ارن شوری سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی اسی جہاز سے دہلی جا رہے تھے۔ یہاں وہ مسٹر انا ہزارے سے ملاقات کے لیے آئے تھے جو اس وقت کرپشن کے خلاف برت رکھے ہوئے ہیں۔ مسٹر انا ہزارے ایک سچے دیش بھگت ہیں مگر جہاں تک ان کے برت کا تعلق ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ ہندستان کا کرپشن کسی آدمی کے برت سے ختم نہیں ہو سکتا خواہ برت رکھنے والے خود مہاتما گاندھی کیوں نہ ہو۔

مسٹر ارن شوری سے میں نے پوچھا کہ انڈیا میں آج کل جوڈیشل ایکٹیوزم زوروں پر ہے۔ بہت سے لیڈر عدالتی کارروائیوں کی زد میں ہیں۔ کیا اس سے ملک میں کچھ سدھار آئے گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ صرف جوڈیشل ایکٹیوزم سے تو کسی سدھار کی امید نہیں۔ ہمارے ملک کا کرپشن بہت گمبھیر ہے۔ پھر انھوں نے مسکرا کر کہا کہ کم از کم اس معاملہ میں اسلامی شریعت کو نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک کچھ لوگوں کو کڑی سزا نہ دی جائے حالات میں سدھار ہونے والا نہیں۔

واپسی میں جہاز کے اندر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے بتایا کہ میرا پونہ کا سفر ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آج کل ہر روز جگہ جگہ کانفرنسیں ہو رہی ہیں، کیا ان کا کوئی فائدہ بھی ہے۔ میں نے کہا کہ ہر چیز کا ایک براہ راست فائدہ ہوتا ہے اور ایک بالواسطہ فائدہ۔ میں جانتا ہوں کہ ان کانفرنسوں کا براہ راست فائدہ نسبتاً کم ہے مگر ان کا بالواسطہ فائدہ بہت زیادہ ہے۔ اور اسی کے لیے میں ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہونے والی کانفرنسوں میں شریک ہوتا ہوں۔ ان کانفرنسوں میں مختلف علاقوں اور مختلف ملکوں کے لوگ آتے ہیں۔ عام حالات میں اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو یہ ایک بے حد مشکل کام ہوگا۔ مگر کانفرنس میں یہ مختلف قسم کے لوگ ایک جگہ مل جاتے ہیں۔ ان سے ملاقات اور انٹرایکشن کی صورت میں جو فائدہ ہوتا ہے وہ بے حد اہم ہے۔ یہ فائدہ

کتابوں کے مطالعہ سے یا اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کے انٹرایکشن سے انسانی تجربات میں اور عمومی طور پر انسانیت کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

اس کے علاوہ ان کانفرنسوں کے دوران تعمیری موضوعات کا جو چرچا ہوتا ہے اس سے ان کے حق میں ایک عمومی فضا بنتی ہے جو کسی اور طرح نہیں بن سکتی۔

یکم دسمبر ۱۹۹۶ کی شام کو دہلی واپسی ہوئی تو مغرب بعد کا وقت ہو چکا تھا۔ میرا یہ سفر خلاف معمول کافی لمبا تھا۔ اس سے پہلے میں صرف ایک دن کے لیے پونہ آیا تھا۔ مگر اس بار پورے آٹھ دن پونہ میں گزرے۔ میں نے سوچا کہ یہی زندگی کا معاملہ بھی ہے۔ کچھ لوگ دنیا میں بہت تھوڑا وقت گزار کر مر جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو زیادہ لمبی عمر پاتے ہیں۔ تاہم اس معاملہ میں اصل اہمیت مدت کی نہیں ہے۔ اصل اہمیت یہ ہے کہ آدمی نے کیا پایا اور کیا سیکھا۔ کبھی زندگی کا ایک لمحہ اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ وہ صدیوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان دنیا میں اگر سو سال تک جیتا ہے۔ مگر اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ جیسا آیا تھا ویسا ہی واپس چلا گیا۔

پونہ سے واپسی کے بعد جو خطوط ملے ان میں سے ایک خط میری لڑکی ام اسلام کا بھی تھا۔ اس نے پونہ کے پروگرام کے بارے میں اخبار میں پڑھا۔ اس کے بعد اس نے ایک خط لکھا جس کا ایک حصہ یہ تھا:

پونہ کے سمیلن کا پروگرام مرہٹی اخبار میں آیا۔ اس میں شمع جلاتے وقت آپ کا فوٹو ہے سب کے ساتھ۔ مگر سب سے زیادہ کمزور اور دبلے آپ دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ اور بار بار دل میں یاد آتی رہی کہ سب لوگ کیسے صحت مند ہیں اور میرے ابا کی ایسی حالت۔ اللہ تعالیٰ سے خوب خوب دعا کی آپ کی صحت کے لیے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ آمین۔

میری لڑکی کو مجھے دبلا دیکھ کر تعجب ہوا۔ مگر مجھے اس پر تعجب ہے کہ لوگ موٹے کیوں ہیں۔ اگر لوگوں کو اس حقیقت کا احساس ہو جائے کہ ہر لمحہ وہ ایک ناقابل بیان قسم کے سنگین حادثہ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں جس کا نام موت اور قیامت ہے تو لوگوں کا سکون ان سے چھن جائے۔ قہقہے کی آوازیں بلند نہ ہوں۔ فربہ جسم کے مناظر کہیں دکھائی نہ دیں۔

پونہ کے سفر سے واپسی کے بعد جناب عبد الصمد شیخ صاحب کا ایک خط موصول ہوا جو انھیں

کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

آپ پونہ میں ۲۳ نومبر کی شام میں آئے۔ سب سے پہلے یعنی اتوار کے دن ۲۴ نومبر کو حاجی یونس میمن کے گھر پہلی مجلس عصر سے عشار کی نماز تک ہوتی رہی۔ امت محمدیؐ کے کردار کے بارے میں آپ نے جو نئی بات بتائی وہ یہ تھی کہ اِس امت کے لیے دہرا اجر کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس کی ذمہ داری بھی ڈبل ہے۔ خود عمل کرنا اور دوسروں تک پیغام پہنچانا۔

۲۸ نومبر کی رات میں بعد نماز عشاء تنظیم والدین اردو مدارس ضلع پونہ کی جانب سے ایک پروگرام ہوا۔ جس میں پہلے ڈاکٹر فریدہ خانم نے اور پھر آپ نے گفت گو فرمائی۔ جس میں مولانا سید نور صاحب نے تلاوت کی جو سورہ بقرہ کی آخری آیات تھیں جس پر آپ نے تقریر کی۔ اس میں اہم بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے خود ایک دعا مسلمانوں کو سکھائی کہ ہم پر پہلے جیسے لوگوں والا بوجھ نہ ڈال۔ آپ نے اِس میں جو بات کہی وہ یہ تھی کہ سیکولرزم نے تاریخ میں پہلی بار اہل توحید کو یہ موقع دیا کہ بغیر کسی خطرے کے اپنے عقائد کی آزادانہ تبلیغ کریں۔

۲۹ نومبر کی رات، عشاء، بعد جناب عبد الغفار عبد الرحمٰن صاحب کے مکان پر جو نیو ایرا سوسائٹی گول ٹیکڑی پونہ میں ہے جہاں پر تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے تھے تقریر کی۔ اس میں یہ بات بہت ہی نئی تھی کہ یہود انسان کی رسّی پر رہیں گے (آل عمران ۱۱۲) تشریح میں یہ کہا گیا تھا کہ رسّی سے مراد کسی کی گارنٹی پر رہیں گے جیسے امریکہ کی۔ اور آج مسلمان بھی اسی طرح کسی نہ کسی کی گارنٹی پر زندہ ہیں۔

یہ چند باتیں جو مجھے یاد تھیں لکھ رہا ہوں۔ ایک بات جو آپ نے خلیفہ کے تعلق سے امام ابن تیمیہ کے حوالے سے کہی تھی کہ ابن تیمیہ کا فتویٰ ہے کہ خلیفۃ اللہ کہنا ناجائز ہے وہ بہت اہم تھی (فتاویٰ ابن تیمیہ ۲/۴۶۴)

ایک بات آپ نے اور کہی وہ یہ کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے نبی کریمؐ کی پیشین گوئی ہے کہ وہ لوگ جو یہاں دین توحید کے لیے کوشش کریں گے ان کا ثواب بہت زیادہ ہوگا۔ یہ بات بھی لوگوں کو بہت اہم معلوم ہوئی۔

جنوری ۱۹۹۷ کے الرسالہ میں صفحہ ۱۴ پر "زکوٰۃ کا مسئلہ" کے تحت مدوں کے بارے میں جو تفصیل پیش کی گئی ہے وہ پہلی بار شاید آپ نے ہی پیش کی ہے۔ خاص کر اسلام کی اشاعتی مہم کے بارے میں۔

(عبد الصمد شیخ، پونہ، ۲۴ دسمبر ۱۹۹۶)

अल-रिसाला (الرسالہ ہندی)

الرسالہ فورم بھوپال کی جانب سے جلد الرسالہ ہندی کی اشاعت شروع ہوگئی ہے۔ پہلا شمارہ "یکساں سول کوڈ" نمبر ہے۔ جو حضرات الرسالہ ہندی جاری کروانا چاہیں وہ مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں :

The Manager, Al-Risala (Hindi)
C/o Cosmos Commercial Agency, Iqtadar Manzil,
Moti Masjid Square Kamla Park Road Bhopal-462001 M.P. Tel. 530928

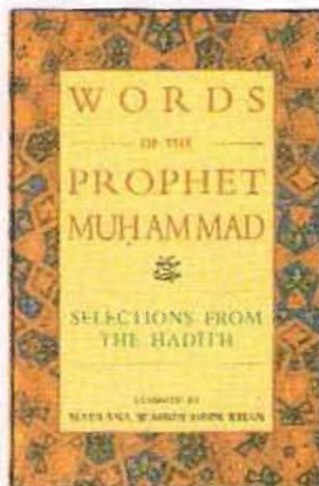
معاون مدیر کی ضرورت

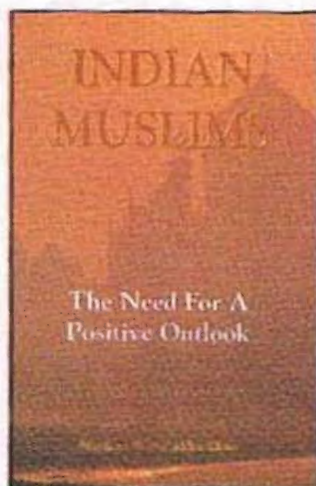
الرسالہ اردو کے لیے ایک معاون مدیر کی ضرورت ہے۔ امیدوار کو اردو زبان پر اچھی دسترس ہونا چاہیے۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر عربی اور انگریزی کی بھی بقدرِ ضرورت صلاحیت موجود ہو۔ امیدوار کے اندر محنت اور لگن کی صفت ہونا ضروری ہے۔ امیدوار حضرات ضروری تفصیل کے ساتھ اپنی درخواستیں روانہ فرمائیں۔

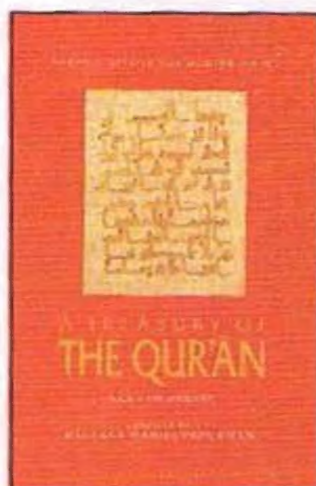
AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013 Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333

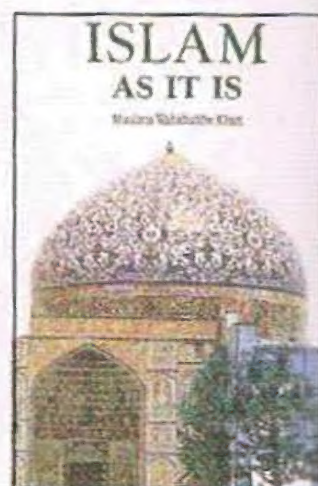
خصوصی اعلان

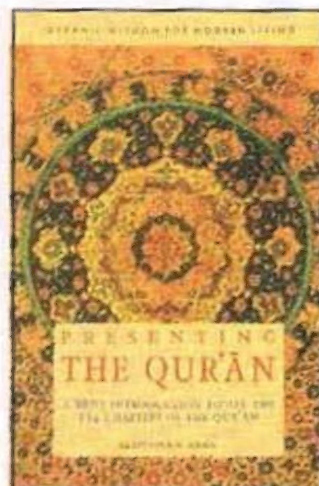
دفتر میں ماہنامہ الرسالہ کے پرانے متفرق شمارے (اردو اور انگلش دونوں زبانوں میں) بڑی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں، جس کو فائدۂ عام کی غرض سے نہایت ارزاں قیمت پر فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپیے ہوگی۔ جبکہ ۱۰۰ یا اس سے زائد شمارے منگوانے کی صورت میں مزید ایک روپے کی تخفیف کر دی جائے گی۔ یعنی ۱۰۰ روپے میں ۱۰۰ شمارے۔ نیز ڈاک خرچ بھی مکتبہ کے ذمہ ہوگا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ بطورِ خود اور مقامی اصحابِ خیر کو ترغیب دے کر اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ تاکہ الرسالہ کے دعوتی اور تعمیری مشن سے وہ لوگ بھی آشنا ہو جائیں جو اب تک کسی وجہ سے آشنا نہ ہو سکے۔ (منیجر ماہنامہ الرسالہ)

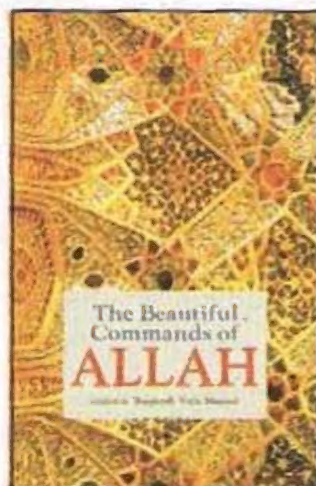

WORDS
OF THE
PROPHET
MUHAMMAD
SELECTIONS FROM
THE HADITH

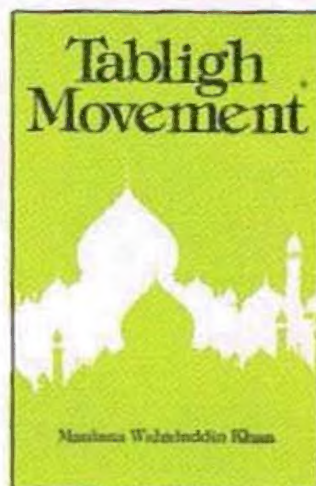

INDIAN
MUSLIMS
The Need For A
Positive Outlook

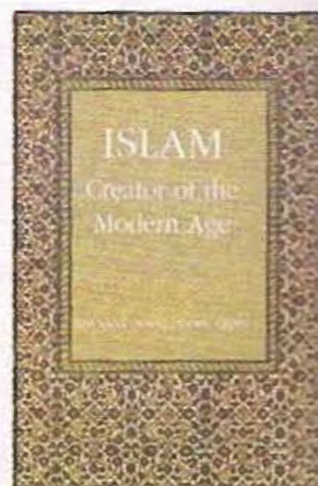

THE QUR'AN

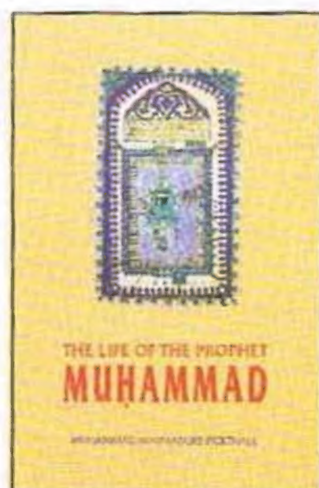

ISLAM
AS IT IS

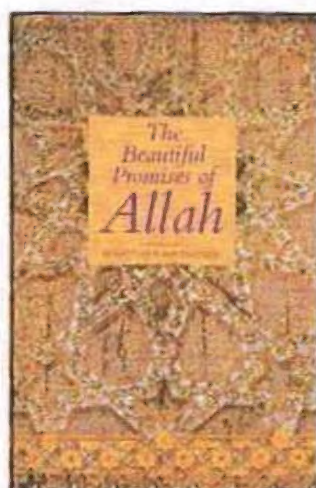

THE QUR'ĀN

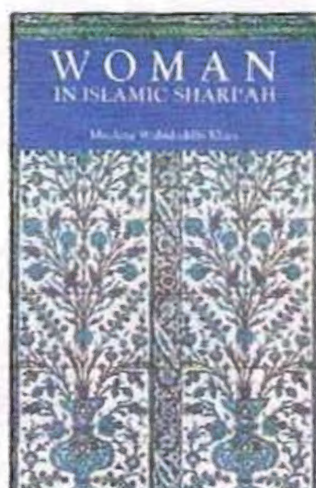

The Beautiful
Commands of
ALLAH

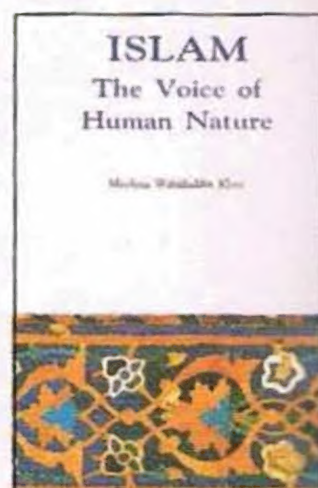

Tabligh
Movement
Maulana Wahiduddin Khan

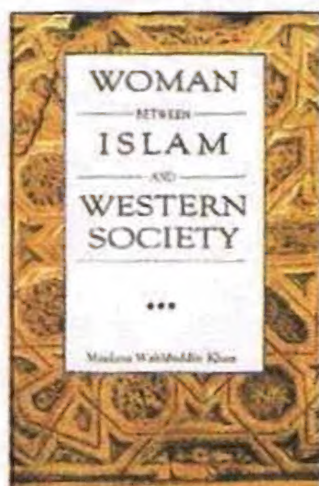

ISLAM
Creator of the
Modern Age

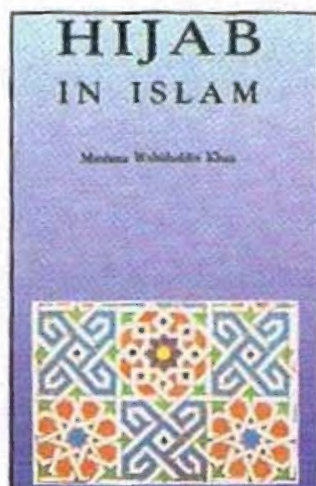

THE LIFE OF THE PROPHET
MUHAMMAD

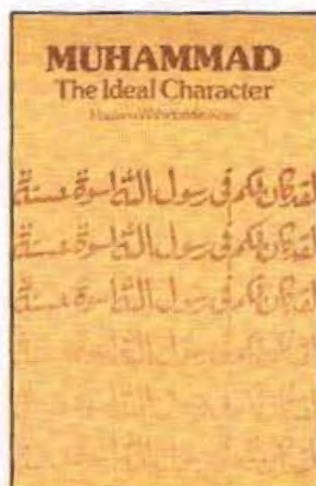

The
Beautiful
Promises of
Allah

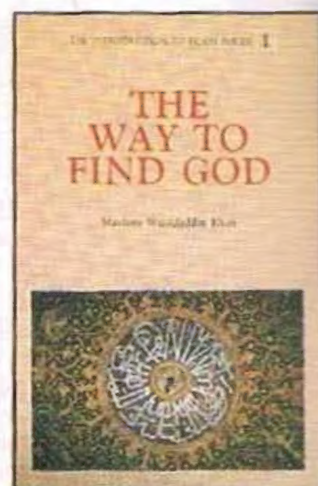

WOMAN
IN ISLAMIC SHARI'AH

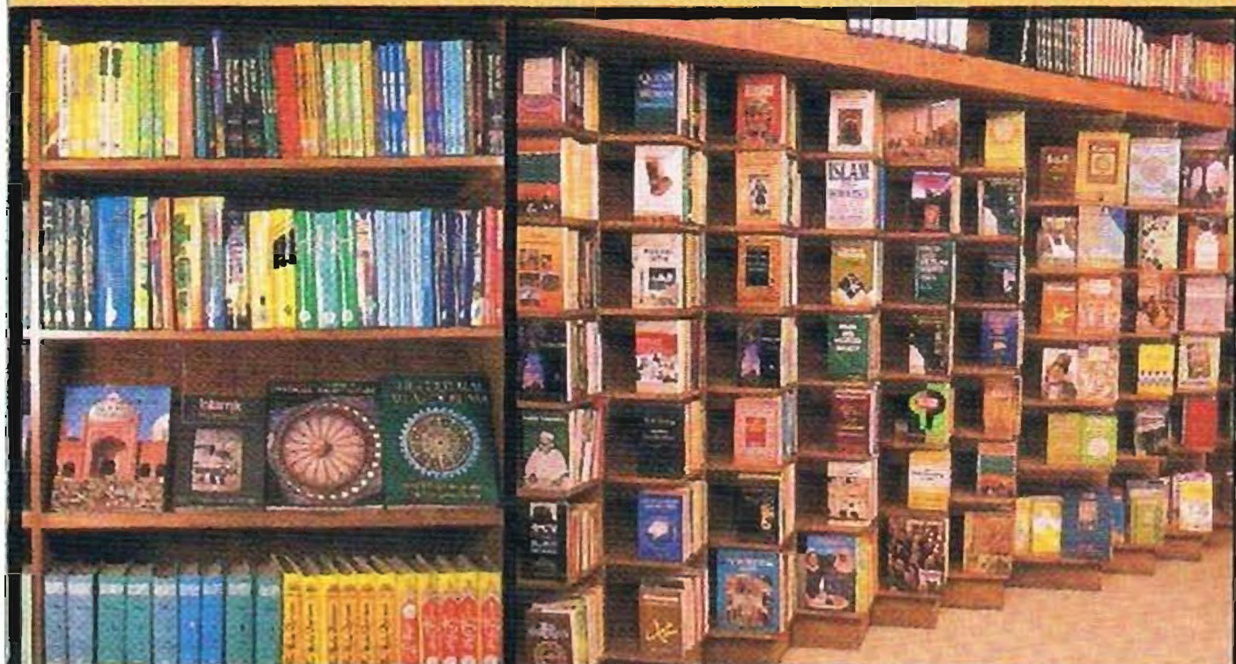

ISLAM
The Voice of
Human Nature

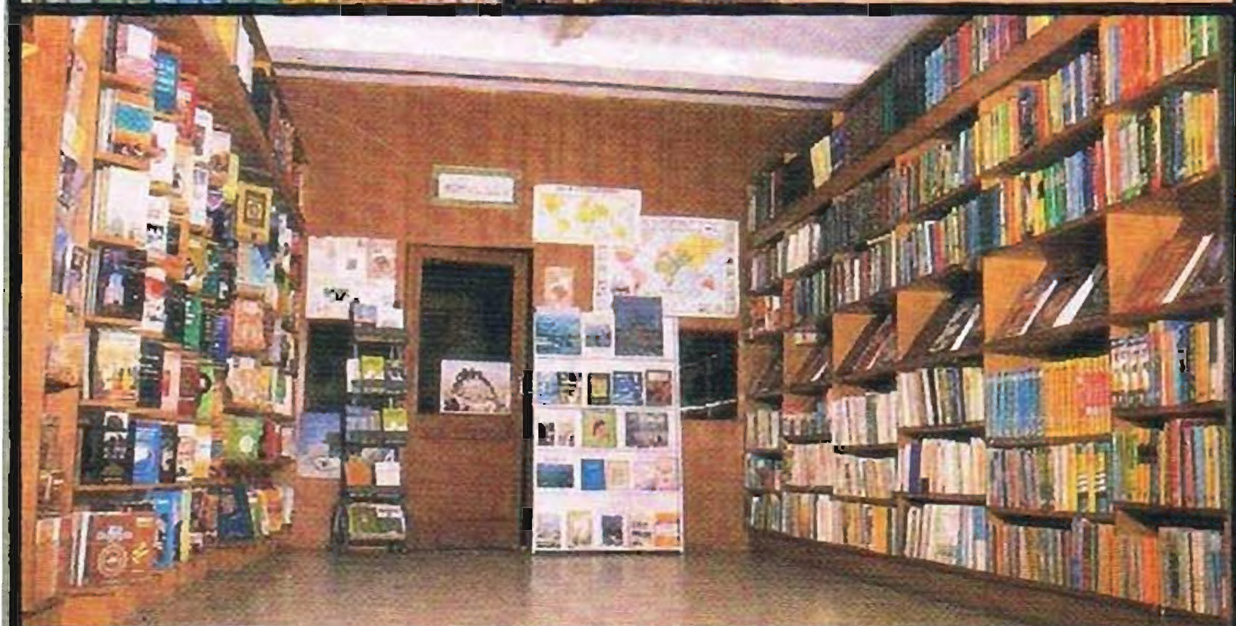

WOMAN
BETWEEN
ISLAM
AND
WESTERN
SOCIETY

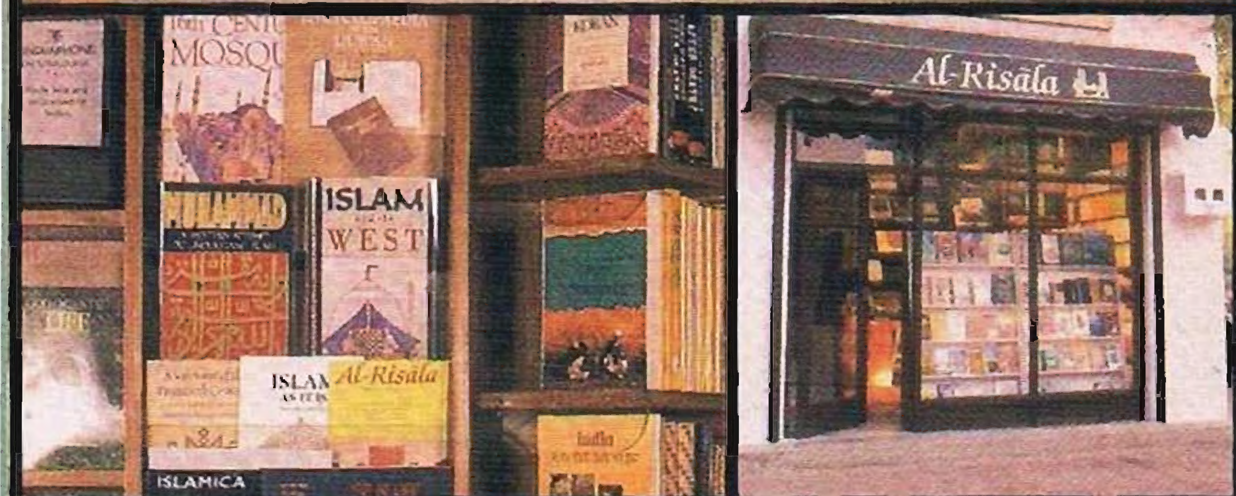

HIJAB
IN ISLAM


MUHAMMAD
The Ideal Character


THE
WAY TO
FIND GOD







RNI 28822/76 • U(SE) 12/97
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/97